لوحِ محفوظ
سیماب
اکبرآبادی
HaSnain Sialvi

لوحِ محفوظ

غزلوں کا تیسرا اور آخری مجموعہ

سیماب اکبرآبادی

ناشر: سیماب اکاڈمی۔ بمبئی ۲

سلسلۂ مطبوعاتِ سیماب اکاڈمی ۲

جملہ حقوق محفوظ

پہلا ایڈیشن : مارچ ۱۹۶۹ء
تعداد : ایک ہزار
مطبع : لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

قیمت : بیس روپے

تقسیم کار :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵ ۔ دہلی ۶ ۔ بمبئی ۳ ۔ علی گڑھ ۱
انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر۔ راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۱
ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۱
مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۴۵۲۶۔ بمبئی ۸

سیماب اکاڈمی بمبئی کے قیام کا بنیادی مقصد علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظم و نثر تخلیقات (مطبوعہ و غیرمطبوعہ) کی ترتیب و تدوین اور اُن پر کیے جانے والے تحقیقی و تنقیدی کاموں کی ہمّت افزائی ہے۔ اکاڈمی نے اِس سمت میں پیش رفت کرنے کی غرض سے جو غیرمعمولی منصوبہ بنایا ہے اُس میں علامہ سیماب کی شخصیت و شاعری سے متعلق تصانیف کی طباعت و اشاعت کا اہتمام بھی شامل ہے۔

سیماب اکاڈمی اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت ڈاکٹر زرینہ ثانی کے تحقیقی مقالہ "سیماب کی نظمیہ شاعری" کو کتابی شکل میں پیش کر چکی ہے اور اب علامہ سیماب اکبرآبادی کی غیرمطبوعہ غزلوں کے مجموعہ "لوحِ محفوظ" کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتی ہے۔

"لوحِ محفوظ" میں سیماب اکبرآبادی کی وہ غیر مطبوعہ غزلیں شامل ہیں جو ۴۳ء سے ۵۱ء کے دوران کہی گئیں اور اُن کے انتقال کے ۲۹ سال کے بعد کتابی شکل میں شائع ہورہی ہیں۔ اس میں اُن کی زندگی کے بالکل آخری ایّام کی وہ دونوں غزلیں بھی شامل ہیں جو انھوں نے فالج کے زبردست حملے کے بعد اپنے زمانۂ علالت کے دوران کہی تھیں۔

اراکین اکاڈمی کو یقین ہے کہ "لوحِ محفوظ" کو نہ صرف یہ کہ عمومی شرفِ قبولیت حاصل ہوگا بلکہ اُن کی غزلوں کا یہ تیسرا اور آخری مجموعۂ کلام اُردو غزل میں سیماب کا مقام متعین کرنے میں ممدد معاون ثابت ہوگا۔

سیماب اکبرآبادی کے پہلے اور دوسرے دواوین "کلیمِ عجم" اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جارہا ہے جو اب کہیں دستیاب نہیں ہیں اور جن کے حصول کے لیے شائقینِ غزل، پرستارانِ سیماب اور ناقدینِ ادب کو اکثر پریشان ہونا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی سیماب اکبرآبادی کی دوسری تصانیف کی ترتیب و تدوین کا کام بھی زیرِ غور ہے۔

۱۹۴۳ء

کسی نے بھی حفاظت سے نہ رکھا اپنے خرمن کو
خزاں ہشیار ہی کرتی رہی یارانِ گلشن کو

ضرورت سوزِ نو کی ہے مرے ذوقِ تپیدن کو
ذرا پھر طور سے آواز دینا برقِ ایمن کو

میں نقشِ مستقل سمجھا کیا تعمیرِ گلشن کو
ہوائیں جنبشیں دیتی رہیں شاخِ نشیمن کو

ہلا دیتا تھا نعروں سے جمود آبادِ گلشن کو
ابھی تو یاد ہوں گی میری تکبیریں نشیمن کو

خدا نا خواستہ کیوں ہو گراں یارانِ گلشن کو
ملی ہے نغمہ سامانی مرے اندازِ شیون کو

جنوں میں کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں ملتا
ترستی ہیں اب آنکھیں آستین و چاک دامن کو

میں خود گلچیں تھا خود ہی باغباں تھا خود گل افشاں تھا
کوئی آئینۂ ماضی میں دیکھے میرے گلشن کو

گری گھبرا کے اک چھوٹی سی کم مایہ پہاڑی پر
دلِ موسیٰ نظر آیا نہ شاید برقِ ایمن کو

خزاں کی اور مری زیست میں فرق قتل و غارت ہے
مٹا سکتا نہیں لیکن لُٹا سکتا ہوں گلشن کو
نگاہِ ابرِ نیساں، پھول اور کانٹے سب برابر ہیں
محبت اک نظر سے دیکھتی ہے دوست دشمن کو
جنوں کھینچے لیے جاتا ہے دامن بھی گریباں بھی
مگر احساس ہوتا ہے گریباں کو نہ دامن کو
خدا کا نام لے "آگے بڑھو" کہنے سے کیا حاصل
ابھی دل کھینچنا آتا نہیں میرے نوازن کو
نہیں ممکن کہ مر کر بھی سکوں حاصل ہو گردش سے
ابھی بننا ہے صبحِ حشر میری شامِ مدفن کو
نمازِ صبح کی بُنیاد ڈالی میں نے گلشن میں
بنایا خوگرِ سجدہ، سرِ شاخِ نشیمن کو
سرِ شاخِ نشیمن بیٹھ کر جب چہچہاتا ہوں
مری گلبانگِ آزادی جگا دیتی ہے گلشن کو
محبت عقل کے بس کی نہیں، راہِ جنوں پر چل
کہ رہبر سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو
رہے محدود ہو کر فطرتِ نشو و نما کب تک
نئی انگڑائی لینی چاہیے، دیوارِ گلشن کو
نہیں ایسا معمّہ کوئی جس کا حل نہیں ممکن
سُلجھنا چاہیے سیماب میرے دل کی اُلجھن کو
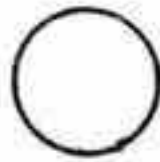
طوفان اُٹھ رہے ہیں ماحولِ گلستاں سے
اے آشیاں نشینو، ہشیار آشیاں سے
لے کر غمِ محبت، بیٹھے ہیں سرگراں سے
یہ بوجھ کیا اُٹھے گا، اک جانِ ناتواں سے
ٹکڑے ٹپک رہے ہیں ہر زخمِ خونچکاں سے
تجھ کو دلِ شکستہ جوڑوں کہاں کہاں سے
پہنچا ہے یہ کہاں تک، آیا ہے یہ کہاں سے؛
اندازۂ سفر کر۔ رفتارِ کارواں سے
پرواز کا ہوں خوگر صحنِ چمن میں لیکن
اپنے ہی آشیاں تک اپنے ہی آشیاں سے
سجدہ نہیں ہے میرا نذرِ فتادگی ہے
ہاتھوں میں سر اُٹھا کر اُٹھوں گا آستاں سے
نزہت چمن کی لے کر آؤں گا آشیاں میں
کھا کر قسم چمن کی جاتا ہوں آشیاں سے
خاکِ چمن ہی وجہ آرائشِ چمن ہے
واقف ابھی نہیں تو دستورِ خاکداں سے

میں لفظِ کُن کا پہلا نقطہ ہوں وہ بھی ناطق
قصّے یہ سب بنے ہیں میری ہی داستاں سے
جو آپ کو بھُلادے اور خودنُما بنادے
یک لمحۂ غم ہے بہتر اُس عیشِ جاوداں سے
تو حاملِ خودی ہے، پھر تجھ میں کیا کمی ہے
چل اپنے آستاں پر، اُٹھ اُن کے آستاں سے
اے طور بُجھ گیا تو، تھوڑی سی دیر جل کر
میں پھُنک رہا ہوں اب تک سوزِ غمِ نہاں سے
سبزہ لہک رہا تھا، غنچے چٹک رہے تھے
جب ہم اسیر ہونے نکلے تھے آشیاں سے
سیمابؔ مصلحت ہے یہ میری تیز گامی
منزل سے پہلے مجھ کو ملنا ہے کارواں سے

○
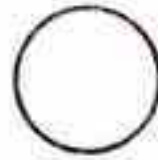
داد لیں گے پردہ داری کی حجابِ دل سے ہم
ایک دن جب خود نکل آئیں گے اس محمل سے ہم

ہاں، نہیں ہیں مطمئن اس گرمیٔ محفل سے ہم
مطمئن کیا ہوں کہ واقف ہیں مزاجِ دل سے ہم

ماسوائے دل نہ خوش ہوں گے کسی منزل سے ہم
دیر و کعبہ سے نہیں، بچھڑے ہوئے ہیں دل سے ہم

کیا ضرورت ہے کہ ہو حسنِ حقیقت آشکار
جب بہل جاتے ہیں اکثر جلوۂ باطل سے ہم

پھر حضورِ حسن بھی جائیں گے سجدوں کے لیے
آزمالیں سر ذرا سنگِ درِ محفل سے ہم

اے تن آسانی ہمارا دامنِ ہمت نہ کھینچ
مشکلوں کی حد تک آئے ہیں بڑی مشکل سے ہم

صبحِ محفل دیکھ کر فق کیوں ہوا چہرے کا رنگ
کیا نہ تھے آگاہ اب تک فطرتِ محفل سے ہم

ہم سے دامن کش ہے کیوں منزل، سمجھ کر گردِ راہ
رہ نہ جائیں گے لپٹ کر دامنِ منزل سے ہم

یہ ہوا معلوم، تھے صدیوں سے محوِ بے خودی
دفعتاً چونکے جو آوازِ شکستِ دل سے ہم
شمع رکھ کر سامنے دیتے ہیں دل کو درسِ سوز
اک اثر لے آئے ہیں پروانۂ محفل سے ہم
ذہن میں ہیں جادۂ ہستی کے کچھ دھندلے نقوش
جیسے پہلے بھی کبھی گزرے ہیں اس منزل سے ہم
موج اٹھی ہے تو اب طوفاں سے کھیلیں گے ضرور
پیاس کیوں اپنی بجھالیں شبنمِ ساحل سے ہم
تا جہانِ حُسن سے پیدا کوئی موسیٰ کریں
بجلیاں چمکاتے پھرتے ہیں سوادِ دل سے ہم
دل کُشا، دل آزما، دل سوز، دل جو، دل نواز
دل ہے عالم ساز، جو چاہیں بنالیں دل سے ہم
حادثاتِ نو کا اب سیماب اندیشہ نہیں
آج کل ٹکرا رہے ہیں اپنے مستقبل سے ہم
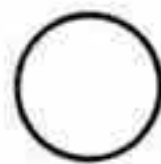
لیجیے دل کی نہ مانی اُٹھ چلے محفل سے ہم
یہ نہ سوچا آپ نے، دل ہم سے ہے یا دل سے ہم
اب نہ دل مانوس ہے ہم سے نہ خوش ہیں دل سے ہم
یہ کہاں کا روگ لے آئے تری محفل سے ہم
اپنے دل کی محفل ویراں سجانے کے لیے
اک نئی تصویر لے آتے ہیں ہر محفل سے ہم
ہائے وہ ہر سو نگاہی، وہ جنوں وہ شورشیں
بے دلی یہ تو بتا پھر کب ملیں گے دل سے ہم
دل کے ٹکڑے، خاک پروانوں کی، آنسو شمع کے
کچھ نہ کچھ لے کر اُٹھیں گے آپ کی محفل سے ہم
غور کرنا ہے مآلِ شامِ محفل پر ہمیں
چھان کر لائے ہیں کچھ خاکسترِ محفل سے ہم
دیکھیے اس خانۂ ویرانی کا کیا انجام ہو؟
اپنی دُنیا لے کے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم
بانیٔ محفل سلامت تیرا جبر و اختیار
آج خالی ہاتھ اُٹھتے ہیں تری محفل سے ہم

دل میں حسرت، آنکھ میں حیرت، نظر میں محویت
ایک محفل لے کے اُٹھے ہیں تری محفل سے ہم

آؤ ڈھونڈیں پھر کہیں کھوئے ہوئے جلوے کلیم
طور سے تم روشنی پھینکو، سوادِ دل سے ہم

دیکھنا سیماب جنت میں ہماری نازشیں
پھر اسی محفل میں ہیں نکلے تھے جس محفل سے ہم

ہیں کہاں سیماب، گہرائی کے موتی دستیاب
کچھ صدف پائے ہیں، جو چُن لائے ہیں ساحل سے ہم

○
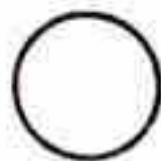
یہ رسمی انقلابِ وقت، تکلیفِ نظر کیوں ہو
قفس میں شام ہو جائے تو ہو جائے سحر کیوں ہو
کسی کو ان مقاماتِ محبت کی خبر کیوں ہو
جہاں میں ہوں وہاں میرے فرشتوں کا گزر کیوں ہو
نہ ہو مرکز، تو پھر کوئی کہاں ہو، جلوہ گر کیوں ہو
ہم آغوشِ تماشا دیدۂ ہر سو نگر کیوں ہو
اگر رستے میں موسیٰ دیکھنے کی ضد نہ کر جائیں
تو پھر گھر پر ہو سامانِ تجلّی، طور پر کیوں ہو
توجہ پر اُسی کی منحصر تاب و تپِ دل ہے
خدانا خواستہ وہ حالِ دل سے بے خبر کیوں ہو
گریبانِ گل و دامانِ لالہ بھی ہے گلشن میں
مجھ ہی پر التفاتِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو
دو عالم کیا مرے اک گوشۂ دل میں ہیں سو عالم
وسیع الظرف ہوں میں، میری دنیا مختصر کیوں ہو
مجھے جلدی نہیں ہے اپنی منزل پر پہنچنے کی
بغیر جلوۂ منزل سرِ جادہ سحر کیوں ہو

محبّت میں نیاز و ناز کے رُتبے برابر ہیں
تو دوشِ حُسن پر کیوں سر نہ ہو اور پاؤں پر کیوں ہو

اسیری اور ایسی بے بسی، اللہ ری مجبوری
کسی نے یہ نہ پوچھا آج تم بے بال و پر کیوں ہو

اُمید و عزم میرے کارواں کی شاہراہیں ہیں
جو ہو مایوس منزل سے وہ میرا ہم سفر کیوں ہو

رہ و رہگیر آسودہ ہیں مجھ سے وہ مسافر ہوں
جو پیچھے مجھ سے رہ جائے وہ میری رہگذر کیوں ہو

بغیرِ پُرسشِ غم بھی تو ہے درمانِ غم ممکن
کرم ہو حال پر میرے تو مجھ سے پوچھ کر کیوں ہو

سب اُن کے طور پر ہیں منتظر، میں خلوتِ دل میں
جہاں سب کی نگاہیں ہیں وہاں میری نظر کیوں ہو

مرا ہم رنگ ہے سیماب رنگِ عالمِ کثرت
بغیرِ اضطراب و درد، دُنیا میں بسر کیوں ہو

○
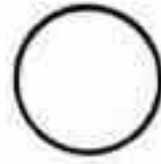
آ، اپنے دل میں میری تمنا لیے ہوئے
شوقِ کلام و ذوقِ تماشا لیے ہوئے

دل لے کے، خود کو رہتے ہیں کیا کیا لیے ہوئے
جیسے وہی تو ہیں مری دنیا لیے ہوئے

محرومیوں پہ دل کی مٹا جا رہا ہوں میں
ہے خاک تیرا نقشِ کفِ پا لیے ہوئے

تاریکئ فضا کا شکایت گزار ہوں
سینے میں آفتابِ سویدا لیے ہوئے

پہلے مرے سہارے پہ تھا کاروبارِ زیست
اب میں ہوں زندگی کا سہارا لیے ہوئے

جی چاہتا ہے عمرِ محبت نہ ختم ہو
مر جائیے کسی کی تمنا لیے ہوئے

اپنا وقارِ عشق کبھی آزما کے دیکھ
ہو گی جبینِ حسن بھی سجدا لیے ہوئے

خوش ہوں کہ جیسے گود میں ہے لعلِ شب چراغ
دامن میں اپنے لالۂ صحرا لیے ہوئے

نعشِ رواں ہوں، زیست ہے میری فریبِ زیست
پھرتا ہوں زندگی کا جنازا لیے ہوئے

جوشِ جنوں میں عالمِ وارفتگی نہ پوچھ
صحرا سے ہم گزر گئے، صحرا لیے ہوئے

سر اُن کے آستاں پہ جو پہنچے تو ہو یقیں
سودا لیے ہوئے ہے کہ سجدا لیے ہوئے

ہم طُور پر گئے بھی تو اس شان سے گئے
موسیٰ کھڑے رہے یدِ بیضا لیے ہوئے

اے حُسن میرے حال میں تو بھی شریک ہو
دونوں جہاں کا بار ہوں تنہا لیے ہوئے

بے پردہ، بے تعیّن و بے نام دیکھ اُسے
وہ تو ہے صرف نام کا پردا لیے ہوئے

سیماب قدرداں ہیں مرے خاں[۱] جانسٹھ
حاضر ہوا ہوں فکر کا ہدیا لیے ہوئے

[۱] خان بہادر سیّد عبداللہ خاں صاحب، رئیس جانسٹھ۔

(مُسلسل)
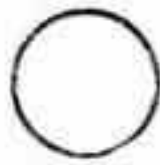
وہ آرہے ہیں اک نئی دنیا لیے ہوئے
چہرے پر انقلاب کا پردا لیے ہوئے
چھٹکائے چاندنی سی جبین صبیح میں
لب ہائے سرخ میں مے و مینا لیے ہوئے
بے باک چتونوں میں صبوحی کا اذنِ عام
مستی کا ہر مژہ میں اشارا لیے ہوئے
وہ اُن کے زمزمے، وہ تبسم، وہ قہقہے
رنگ و نشید و نور کے دریا لیے ہوئے
خال و خدِ جمیل میں بے قید و بے حجاب
زُہرہ کا نور، حور کا جلوا لیے ہوئے
مہتابیاں بھرے ہوئے غازے کی چھوٹ میں
مہندی کے پور میں یدِ بیضا لیے ہوئے
زہرابۂ عتاب کے رنگیں جلال میں
اک تلخئ لذیذ و گوارا لیے ہوئے
مے خانۂ شباب کے میگوں جمال میں
پیمانۂ سکونِ تماشا لیے ہوئے

نغموں سے ہر طبیعتِ ناساز کا علاج
نظروں میں ہر مرض کا مداوا لیے ہوئے
پروردگارِ حُسن و خداوندِ عشق سے
اقلیمِ روح و دل کا اجارا لیے ہوئے
عشق و نشاطِ عام کا دیتے ہوئے پیام
آزادیٔ تمام کا مُژدا لیے ہوئے
باتوں میں دل کشائی، دل آرائی، دل کشی
سانسوں میں معجزاتِ مسیحا لیے ہوئے
تعلیمِ مشرقی سے چُرائے ہوئے نظر
تہذیبِ مغربی کا سہارا لیے ہوئے
تثلیث کو دیے ہوئے حُسنِ قبولِ عام
دوشِ حسیں پہ زلفِ چلیپا لیے ہوئے
دیر و حرم پہ ڈالے ہوئے پردۂ سیاہ
اک نو فروز شمعِ کلیسا لیے ہوئے
آوارگیٔ ذہن و طبیعت کے باوجود
مریم کی آن، شانِ زلیخا لیے ہوئے
قامت میں اپنے جذب کیے طُور کا اُٹھان
تابِ نظر میں برقِ تجلّیٰ لیے ہوئے
خُدّامِ حُسن و ناز جلو میں خدم خدم
ناموس اور حیا کا جنازا لیے ہوئے
ان بجلیوں کا عالمِ امکاں ہے منتظر
بسطِ دکشادِ وادیٔ سینا لیے ہوئے

اُس وقت جو جیے گا وہ دیکھے گا' اور ہم
ہوں گے نقابِ رُخ پہ فنا کا لیے ہوئے
سیماب پیش گوئی مری بے سبب نہیں
امروز ہے تصورِ فردا لیے ہوئے
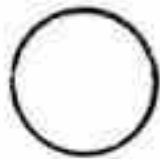
ناز اُدھر نیاز اِدھر کتنا غلط نظام ہے
حُسن نہیں غنیم ہے، عشق نہیں غلام ہے

شام سے دل میں صبح تک، صبح سے تا بہ شام ہے
درد کا انتظام ہے اور بالالتزام ہے

سرخوشی و قلندری، بے خبروں کا کام ہے
گر نہ ہو مشق بے خودی ذوقِ خودی حرام ہے

لمحۂ عمرِ مختصر حادثۂ تمام ہے
اُس کی تباہیاں نہ پوچھ جس کے لیے دوام ہے

امن و سلام ہے وہاں میرا جہاں مقام ہے
جُرم ہے دل شکستگی، دل شکنی حرام ہے

حُسن کی ہر نگاہِ ناز ایک نیا پیام ہے
ردّ و قبول، جرأت و ظرفِ نظر کا کام ہے

دل ہے اور اُس کا ذکر و فکر لب پہ مدام اُس کا نام ہے
ننگ ہے ورنہ ہر نفس، ننگ نہیں حرام ہے

کعبہ و طور و عرشِ دل یہ تو ہیں سب مقامِ دوست
تیرا بھی ہے کوئی مقام، تیرا کہاں مقام ہے

شمع پہ جل بُجھا پتنگ، ہوگیا نذرِ برقِ طور
حوصلۂ کلیم میں مجھ کو ذرا کلام ہے

دل کے معاملات بھی طرفہ معاملات ہیں
جس کو نہیں ہے مجھ سے کام مجھ کو اُسی سے کام ہے

بجھنے کو ہے مری لگی، جلنا ہے تجھ کو رات بھر
شمع سحر ہوں میں اگر، تو بھی چراغِ شام ہے

سوزِ وفا کا تکملہ، کر نہ سکا غم آپ کا
عشق تو ناتمام تھا، حُسن بھی ناتمام ہے

صبحِ وطن کے منتظر! کھا نہ فریبِ عیشِ نو
پردۂ انقلاب میں صبح نہیں ہے شام ہے

دیر و حرم میں جاگزیں، اس کے سوا کوئی نہیں
تجھ کو یہ آگہی نہیں بُت بھی خدا کا نام ہے

ہاتھ رہیں بندھے ہوئے، آنکھ رہے جھکی ہوئی
محفلِ قرب میں یہی، قاعدۂ سلام ہے

یہ شرفِ دیارِ عشق اور یہ مفت بخشیاں
کام ہے حُسنِ دوست کا، میری وفا کا نام ہے

وہ بے خودی کا آئینہ جس میں جھلک اُٹھے خدا
تجھ کو خودی سے واسطہ، تو تو ابھی غلام ہے

پاؤں اور آستانِ دوست، پاسِ ادب ہے خلاف
دل نہ اگر ہو ہم قدم، طوفِ حرم حرام ہے

مُردہ نظامِ حُسن و عشق، درسِ حیات مجھ سے لے
میری طرف سے وارثی سب کو صلائے عام ہے
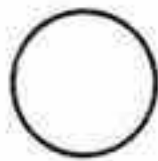
اُٹھتا ہوں جب چمن میں نمازِ سحر کو میں
سجدے میں دیکھتا ہوں ہر اک برگ و بر کو میں
تعلیمِ ضبط دوں، دلِ شوریدہ سر کو میں
وہ چاہتے ہیں راکھ بنا دوں شرر کو میں
دے کر فروغ قوتِ فکر و نظر کو میں
پھیلا رہا ہوں زندگیٔ مختصر کو میں
میرے قدم میں برقِ تجسس، وہ سست گام
پیچھے نہ چھوڑ جاؤں کہیں راہبر کو میں
شامِ قفس کو صبح کے جلوے کہاں نصیب
دھوکا سمجھ رہا ہوں نمودِ سحر کو میں
یہ ہے حقیقتِ غم و غم خواریٔ جہاں
دو دن میں یاد بھی نہ رہا نوحہ گر کو میں
کیا تھے وہ بے خودی کے مقامات کچھ نہ پوچھ
ترسا کیا ہوں جلوۂ شام و سحر کو میں
خواب آزما رہی خبرِ صبحِ انقلاب
ٹھہرا جب آشیاں میں کبھی رات بھر کو میں

جب سر جھکے، تو سامنے بیٹھ اور غور کر
پیارا ہے سنگِ در مجھے یا سنگِ در کو میں
کارِ قفس دراز ہے اور زندگی ہے کم
گلشن سے اب گیا تو گیا عمر بھر کو میں
نالے بھی اپنے گھر کے ہیں، نغمے بھی گھر کے ہیں
تم شام کو جگاؤ، جگاؤں سحر کو میں
اے طُور کوئی جلوۂ باقی تبرّکاً!
آیا ہوں آزمائشِ تابِ نظر کو میں
اُن کا پتہ نہ وسعتِ کونین میں ملا
اپنی طرف سمیٹ رہا ہوں نظر کو میں
رکھ آشنائے راہِ وطن مجھ کو اے جنوں
شاید پھر اتفاق سے یاد آؤں گھر کو میں
لب خشک، دل جلا ہوا، آنکھیں جھکی ہوئی!
پہچانتا ہوں اُن کے خرابِ نظر کو میں
دن رات چل رہے ہیں مرے ساتھ راستے
رہگیر دیکھتا ہوں ہر اک رہ گزر کو میں
سیماب جلوۂ پسِ پردہ ہے خود فریب
الزام دے رہا ہوں مجالِ نظر کو میں

○
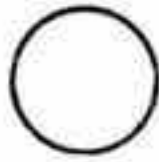
درد نے سعیٔ دل کشائی کی
بڑھ گئی ہمت آشنائی کی
آڑ میں تیری کبریائی کی
ذرّے ذرّے نے خود نمائی کی
داد پائی شکستہ پائی کی
رہ گئی شرم نارسائی کی
نہ ملی بے خودی سوائے خودی
روح تک چھان لی خدائی کی
زندگی موت بنتی جاتی ہے
حد بھی ہے صبر آزمائی کی
مجھے بندہ بنا کے بھول گئے
تھی ادا یہ بھی کبریائی کی
ہے قفس بھی حدودِ گلشن میں
اب ضرورت نہیں رہائی کی
جیسے دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں!
ہائے راتیں تری جدائی کی

بھیک دنیا سے مانگنے والے
درِ دل پر کبھی گدائی کی؟
مجھے اب بندگی کی تاب نہیں
خیر ہو تیری کبریائی کی!
برق بن کر گرے گی زنداں پر
یہ جو ہے اک تڑپ رہائی کی
یہ ہمالہ، یہ طور، یہ افلاک
سیڑھیاں ہیں مری رسائی کی
بندگی پر مری نہ ہو مغرور
مجھے عادت ہے جبہ سائی کی
بندگی سے ملے کہیں تو نجات
ایک حد کھینچ دے خدائی کی
جان کر بندۂ وفا سیماب
مجھ سے دُنیا نے بے وفائی کی
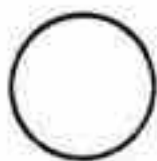
پہنچے تا بہ منزل کیا، سلسلہ یہاں اپنا
راستے ہیں سب اُن کے اور کارواں اپنا
کیا کریں کہیں قائمُ عارضی نشاں اپنا
ہے وہی مکاں اپنا، جی لگے جہاں اپنا
بزمِ حُسن میں ہوگا، کون ترجماں اپنا
دل پہ کچھ بھروسہ تھا، دل مگر کہاں اپنا
دقتِ راہِ منزل میں ہو نہ رائیگاں اپنا
روز رُخ بدلتا ہے میرِ کارواں اپنا
فاش کیوں نہیں کرتا رازِ جبر و مجبوری
کیوں خراب کرتا ہے نامِ آسماں اپنا
درد کو خدا رکھے، کروٹیں بدلوا دیں
ورنہ کون شامِ غم، تھا مزاج داں اپنا
دیکھ لیتی خوابیدہ، کارواں بہاروں کے
جائزہ اگر لیتی صبحِ گلستاں اپنا
کیا عجب بدل ڈالے اک دن اپنی فطرت بھی
رنگ تو بدلتا ہے روز آسماں اپنا

موج دائرہ بن کر آشنائے مرکز ہے
بن گیا یقیں آخر پھیل کر گماں اپنا

دورِ غم ہے لامحدود، حدِّ زیست نامعلوم
کام کیوں نہیں کرتی مرگِ ناگہاں اپنا

اب کھلا کہ میں اُن کی ذات کا خلاصہ ہوں
پوچھ کر پتہ میرا دے گئے نشاں اپنا

ناز سے نیازش کو انتقام لینا ہے
تو بھی اے زمیں رکھ لے نام آسماں اپنا

ہیں یہ سب گلے شکوے، بر بنائے لاعلمی
ورنہ بجلیاں اپنی اور نہ آشیاں اپنا

یہ غلط نشانہ کیا، طورِ ختم، غش موسیٰؑ!
تم نے لے لیا ہوتا پہلے امتحاں اپنا

سر اُٹھا کے بھی ہم کو سجدہ کرنا آتا ہے
آپ اپنے گھر رکھیں سنگِ آستاں اپنا

تھا مقابلہ سیمابؔ عمرِ بزمِ فانی سے
ہم بھی چھوڑ آئے ہیں نقشِ جاوداں اپنا

وہ بلا سے دشمنِ دیں سہی، وہ کنشت و دیر نشیں سہی
مرے اعتبار میں بُت تو ہے، جو خدا نہیں تو نہیں سہی
مرا دل ہی جلوہ سرا سہی، مرا دل ہی عرشِ بریں سہی
وہ کہیں سہی، وہ کہیں تو ہیں، جو وہ ہیں کہیں تو کہیں سہی
مجھے تیرا غم تو نصیب ہے، ترا در نہیں تو نہیں سہی
مرا سینہ داغ ہی داغ ہے، میں ہزار سادہ جبیں سہی
ترے حُسن پر جو نہ ہو گراں، تو اِدھر بھی پھینک دے بجلیاں
سرِ طور موردِ امتحاں، جو کوئی نہیں تو ہمیں سہی
حرم اور دَیر ہیں اُن کے گھر، ہمیں کھینچ لائی تھی یہ خبر
کریں کیوں تلاش اِدھر اُدھر، نہیں جب یہاں تو کہیں سہی
ہے سرِ نیاز بلند تر، مگر اس کی تجھ کو نہیں خبر
تری روح پر ہے مری نظر، ترے نقشِ پا پہ جبیں سہی
تری قوتوں کی فزائشیں، ہیں تری خودی کی نمائشیں
تو خود ایک تودۂ خاک ہے، ترے بس میں ساری زمیں سہی
یہ مرا تصورِ مستقل، ہے مثالِ سایہ قدم قدم
میں اُسی کے ساتھ ہوں دم بہ دم، وہ کہیں ہے وہ کہیں سہی

مری ذاتِ حُسن کی ذات ہے مجھے سجدہ کرنے دے پاسباں
اگر اُن کا در ہے یہ آستاں، تو جبیں بھی اُن کی جبیں سہی
جو شریکِ عشق ملال ہے، تو ستم بھی خُبرو جمال ہے
کریں کیوں تلافیٔ جَورِ وہ، مری بے کسی کا یقیں سہی
مرے سوزِ غم سے اثر نہ لے، مگر اپنے دل میں جگہ تو دے
ترے پاس دل تو ہے بے وفا، ترے دل میں درد نہیں سہی
ہے کوئی تو بات کہ ہمنشیں، مرے دل کو اب بھی سکوں نہیں
یہ ہُوا خیال گُش سہی، یہ گھٹا نگاہ نشیں سہی
جو گلے نہ اُن کو لگا سکوں تو پھر ایسے قرب سے فائدہ؟
مری دسترس سے تو دور ہیں وہ رگِ گلو سے قریں سہی
یہ جُنونِ دار و رسن مٹا، ہمیں یاد کر ہمیں دے صدا
کوئی اور مردِ رہِ وفا، جو نہیں رہا تو ہمیں سہی
تجھے نذر کر کے میں اپنا سر، کروں سجدہ، بار نہ ہو اگر
کوئی دن بقیدِ جبیں رہا، کوئی دن بغیرِ جبیں سہی
میں اگر نظر نہ اُٹھا سکوں، تو نقاب تیرا اُٹھے نہ کیوں؟
تجھے تابِ جلوہ گری تو ہے، مجھے تابِ دید نہیں سہی
ہو اگر ضرورتِ پاسباں، تو بنا لے اپنا نگاہباں
میں امینِ عشق و وفا تو ہوں، ترے حُسن کا بھی امیں سہی
دل و ذہنِ دوست میں وارثیؔ، ہے رسائی میرے خیال کی
میں اسیرِ رشتہ بپا سہی، میں فقیرِ گوشہ نشیں سہی

○

اگر نہ میرے سر، اور تیرے آستاں سے چلا
بتا، کہ سجدوں کا دستور پھر کہاں سے چلا
چلا تھا دل سے جو جادو، نہ وہ زباں سے چلا
کسی طرح نہ مرا کام ترجماں سے چلا
رہِ حیات میں چل، زندگی کی شانوں سے
چلا فضول جو بیزارِ جسم و جاں سے چلا
فنا کے ہاتھ سے، جانِ آدمی بچا نہ سکا
غریب بچ کے بہت مرگِ ناگہاں سے چلا
تھا آشیاں میں، تو سب ہم نشیں تھے غنچہ و گُل
چلا تو ساتھ نہ کوئی بھی آشیاں سے چلا
نشاطِ جادہ و ذوقِ خرام و گرمیٔ شوق!
میں بڑھ کے چار قدم گردِ کارواں سے چلا
ہے چل چلاؤ یہ عالم یوں ہی ہمیشہ سے
بتائے کون کہ یہ سلسلہ کہاں سے چلا
پناہ مل نہ سکی اُس کو میرے دل کے سوا
تلاش میں جو مکاں کی وہ لامکاں سے چلا

ہمیں نے نغمۂ آزادیٔ چمن چھیڑا
پتہ قفس کا ہمارے ہی آشیاں سے چلا
ہوئی نہ ختم نگاہِ جواں کی دل دوزی
کماں میں آ گیا وہ تیر جو کماں سے چلا
مری گرانیٔ رفتار پر نہ کر تنقید
یہ غور کر میں کہاں آ گیا کہاں سے چلا؟
نگاہ و دل پر اک ایسا بھی واقعہ گزرا
کہ جیسے پردہ کوئی اُٹھ کے درمیاں سے چلا
ہوس کی چل نہ سکی رعبِ حُسن کے آگے
چلا تو دامنِ یوسفؑ، مگر کہاں سے چلا
نظر بلند رہی حوصلے بلند رہے
زمین پر بھی میں رفتارِ آسماں سے چلا
نشاطِ وقت نے پھر غم بھُلا دیا تیرا
پھر ایک لمحہ مری عمرِ جاوداں سے چلا
سخن کا قافلہ، تھا سُست گام اے سیماب
رواجِ گرم روی میرے کارواں سے چلا

○
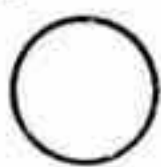
تھی نہ تسکینِ نظر حُسن کی محفل سے مجھے
کام لینا ہی پڑا جلوہ گہِ دل سے مجھے
چشمِ بیدار ملی ہے، تپشِ دل سے مجھے
نیند کیا، موت بھی اب آئے گی مشکل سے مجھے
تھا میں نازاں ابھی آسودگیٔ ساحل پر
دفعتاً کھینچ لیا موج نے ساحل سے مجھے
مانعِ پردہ کشائی، ادبِ اُلفت ہے
ورنہ ربطِ ازلی ہے ترے محمل سے مجھے
اثرِ کوششِ عرفانِ حقیقت معلوم
ابھی فرصت نہیں اندیشۂ باطل سے مجھے
دیکھنا قوتِ واماندگیٔ پائے طلب
کہ ہلا بھی نہ سکی جادۂ منزل سے مجھے
بجلیاں چمکی ہیں طوفان کی تاریکی میں
فیض پہنچا ہے چراغِ سرِ ساحل سے مجھے
سادگی ہائے جنوں میں یہ تکلف توبہ!
اور وحشت سی ہوئی طوق و سلاسل سے مجھے

قوتِ جبر بھی ہے عشق کی مجبوری میں
یاد ہوگا کہ بھلایا نہ گیا دل سے مجھے
عرصۂ حشر میں ملنا مرا آسان نہ تھا
اُس نے پہچان لیا نالۂ سرا دل سے مجھے
شمع و آئینہ و پروانہ و گُل سب ہیں خموش
اور پھر کس نے پکارا تری محفل سے مجھے؟
رکھ سکی کیوں نہ چھپا کر مجھے خودداریٔ عشق
حُسن کیوں دیکھ سکا پردۂ محمل سے مجھے
لیے بیٹھا رہا پردوں میں حقیقت کو حرم
دَیر نے لوٹ لیا جلوۂ باطل سے مجھے
عالمِ ہُو ہی سہی، عالمِ ہستی نہ سہی
آپ سے کام ہے یا آپ کی محفل سے مجھے
بے دلی مَوت نہیں، مَوت سے بھی بدتر ہے
جان لے لے مری، محروم نہ کر دل سے مجھے
موجِ دریا پہ گراں ہے مری ہستی سیماب
کیا سمجھ کر یہ اُٹھا لائی تھی ساحل سے مجھے؟
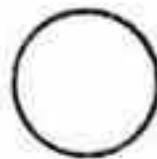
تو نے مجھ کو تو رہا قید سے صیاد کیا
میری تقدیرِ غلامی کو بھی آزاد کیا

اُس نے دستورِ اسیری عجب ایجاد کیا
کر لیا قید اُسے دل میں جسے آزاد کیا

سرد کو گرم کیا، صید کو صیاد کیا
میں نے گلشن میں جب اک نالۂ آزاد کیا

کچھ اِس انداز سے منہ پھیر کے آزاد کیا
دیر تک میں نے طوافِ درِ صیاد کیا

تو نے یہ کیا ستم اے گرمیِ فریاد کیا
پھونک دی آگ سی جب میں نے انھیں یاد کیا

پردۂ نغمہ لیا، حیلۂ فریاد کیا
مجھ سے جس طرح بنا، میں نے تجھے یاد کیا

کیا کبھی دادِ وفا کے لیے زحمت دی تھی
آپ نے کیوں مجھے شرمندۂ بے داد کیا

تھا وہی حاصلِ لاحاصلیِ عمرِ نیاز
میں نے سر دے کے جو اک سجدۂ آزاد کیا

نالۂ نے ہو کر آوازِ شکستِ غنچہ
جس کی جتنی تھی بساط، اتنا تجھے یاد کیا
میں نے شکوہ نہ کیا حشر میں بربادی کا
کس سے کہتا کہ مجھے دوست نے برباد کیا
چیرہ دست اتنی خزاں، اور یہ آساں کاری
خار کو چھوڑ دیا، پھول کو برباد کیا
وہ کرے یاد انھیں جس نے بھلایا ہو کبھی
میں نے اُن کو نہ بھلایا نہ کبھی یاد کیا
خاکِ ہستی کا وہ اک ذرّۂ جاندار تھا میں
زیست اور موت نے برسوں جسے برباد کیا
بعدِ مدّت یہ ملاقات، یہ ہنگامۂ حشر!
آپ نے یاد کیا بھی تو کہاں یاد کیا!
شاملِ وضع تھی، خودداریٔ فطرتِ سیمابؔ
ہم جسے بھول گئے، پھر نہ اُسے یاد کیا

○
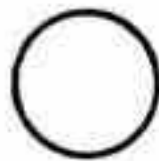
فغاں سونے نہیں دیتی، دلِ بیدار ساماں کی
گلستاں کیا ہے، فطرت جاگ اُٹھتی ہے گلستاں کی
زیارت ہے ابھی باقی تجلّی گاہِ جاناں کی
میں اِس دنیا پہ کیوں بازی لگا دوں دین و ایماں کی
فروغِ زندگی کیا روشنی ہو بزمِ امکاں کی
مثالِ شمعِ کشتہ، بُجھ گئی ہے روح انساں کی
قریبِ شام، رنگ و بو کی سُن خاموش تسبیحیں
سمٹ کر جب زباں بن جائے ہر پتّی گلستاں کی
نہ ہوگا نور، نذرِ نار، دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو
اسے جلنا نہیں آتا، یہ مٹّی ہے مسلماں کی
جو اُن کی آرزو میں جاگنے دے اور نہ سونے دے
مری آنکھوں سے پوچھو قدر اُس خوابِ پریشاں کی
یہ کیا خرمن لگا رکھے ہیں رنگینی کے دنیا نے
انھیں تو ایک چنگاری بہت ہے سوزِ پنہاں کی
یہ جتنے پھیپھے ہیں دفعتاً سب ختم ہو جائیں
مگر گلشن تک آتی ہی نہیں فریادِ زنداں کی

تجاہل کب تک، آخر وہ مجھے پہچان جائیں گے
کمالِ جہل ہی سے ابتدا ہوتی ہے عرفاں کی

ہے پاس آدابِ زنداں کا، وگرنہ جانتا ہوں میں
کہ سنگ و خشت کا انبار ہے دیوارِ زنداں کی

وہ ہوں گے جلوہ گر سیماب، شاید عالمِ نو میں
خبر تو آرہی ہے انقلابِ بزمِ امکاں کی
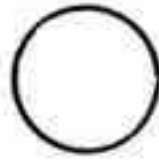
دل میں جذبے بے نیازی کے امانت کردیے
آپ نے دونوں جہاں مجھ کو عنایت کردیے
دل کے ٹکڑے پھول کلیوں میں امانت کردیے
یہ خزانے میں نے گلشن کو ودیعت کردیے
وہ خودی جس نے خدائی حوصلوں کے ساتھ کی
اُس سے یہ پوچھو کہ انساں کتنے غارت کردیے؟
چھیڑ دی میں نے جو اپنی داستانِ زندگی
ساری دُنیا کے فسانے بے حقیقت کردیے
جن سے دورِ حال کی تہذیب کا امکان تھا
میں نے ماضی کے وہ سب آثار رخصت کردیے
فکرِ دنیا، کاوشِ عقبیٰ، غمِ عشق و وفا
جتنے غم تھے، سب خدا نے مجھ کو قسمت کردیے
خوئے استغنا کی بے چارہ نوازی دیکھیے
خاک کے ذرّے مرے دامن میں دولت کردیے
خود نُمائی، خود پرستی، خود روی، خود مطلبی
یہ گنہ کس نے شریکِ آدمیت کردیے؟

سامنے ہے منزلِ مقصود، اور اک دو قدم!
حوصلے کیوں پست یارانِ طریقت کر دیے
جس قدر انسانیت کے منتشر جذبات تھے
جمع سب ہم نے بہ عنوانِ محبت کر دیے
ناخدا کو اُن کی غرقابی کا کیوں الزام دوں
جو سفینے خود مری غفلت نے غارت کر دیے
آئینے کیا، دشتِ ہستی سے اُٹھا ایسا غبار
محفلِ عالم کے دل بھی پُر کدورت کر دیے
اللہ اللہ تیرہ بختی کی کرم فرمائیاں
کچھ ستارے بھی انیسِ شامِ غربت کر دیے
حشر کے دن کیا نچھاور اُن کے قدموں پر کروں
جتنے سجدے تھے وہ سب نذرِ عبادت کر دیے
فکر کو سیماب آزادی کی دے کر وسعتیں
مرتبے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیے

تنگیٔ رہگذارِ فنا سے یہاں سلسلہ چھڑ گیا پیش و پس کا
ورنہ ہستی سے تا سرحدِ نیستی، فاصلہ تھا فقط اک نفس کا

باز آیا جنونِ بہاراں سے میں، جوشِ وحشت نہیں میرے بس کا
میں اسی سال دیوانہ ہونے کو تھا، اور یہ روگ ہے ہر برس کا

بے خودِ کیف نغماتِ ناگاہ ہیں اُٹھ کے بڑھنے کی قوت کہاں تھی
محو ہو جاؤں شورِ سرِ راہ میں، تھا یہ مقصود بانگِ جرس کا

کیا کہوں شامِ غم کس کی ہوں یاد میں، ہم نشیں مصلحت مہرِ لب ہے
ڈھونڈ لے میرے اندازِ فریاد میں، نام ہے میرے فریاد رس کا

اہلِ گلشن سے کرتا وصیت نہ میں اپنی تدفین کی کنجِ گل میں
کیا خبر تھی کہ تربت پہ دو روز میں ڈھیر لگ جائے گا خار و خس کا

لالہ و گل کی رودادِ بے چارگی، فرصتِ غور بھی چاہتی ہے
شاد ہوگا نہ ہنگامۂ باغ سے، مطمئن رہنے والا قفس کا

اُس نے وجدان کو دے کے درسِ وفا، خود ہی دامن کشی کی ہوس سے
اور خود حُسن ہی ممتحن بن گیا امتیازاتِ عشق و ہوس کا

فصلِ گُل میں مجھے، دامِ صیاد سے اتفاقاً رہائی ملی ہے
اُس کے سہوِ نظر میری تقدیر سے ، دَر کھلا رہ گیا تھا قفس کا

دیکھتا ہوں کہ سیماب رنگِ وفا صورتِ فصلِ گل جوش پر ہے
میری آنکھوں میں ہے اشکِ خوں کی جھلک جیسے پھولوں میں اُٹھا ادرس کا
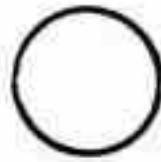
جس میں رنگینیٔ خیال نہیں
وہ غزل میرے حسبِ حال نہیں
پہلے غم تھا طبیعتِ ثانی
اب کسی بات کا ملال نہیں
ہوں رہینِ سکونِ مستقبل
مجھے فکرِ نشاطِ حال نہیں
ہائے تنہائیاں محبت کی!
غم بھی اُن کا شریکِ حال نہیں
بے طلب اُن سے کچھ نہیں ملتا
اور میں خوگرِ سوال نہیں
میں نہیں اُس جلال کا قائل
جو سراپردۂ جمال نہیں
بے دلی سے نہ ٹال دیوانے
زندگی ہے کوئی وبال نہیں
وقت شاید بہار کا بدلا
کہ جنوں مجھ کو اب کے سال نہیں

اک خوشی ہر ملال تھا پہلے
اب خوشی کوئی بے ملال نہیں
ہوں چمن میں بھی آشیاں سے دور
کوئی مجھ سا شکستہ بال نہیں
ابھی ہوں محوِ عشرتِ آغاز
ابھی انجام کا سوال نہیں
بجھ گئے دل کے ولولے شاید
اب وہ تابانیٔ خیال نہیں
حسنِ تخلیق کو فراواں کر
کہ میں آسودۂ جمال نہیں
ہے ہمارا مشاہدہ سیماب
حسن پابندِ عمر و سال نہیں
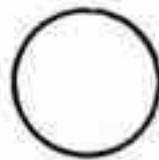
مرا غبارِ وطن کی تلاش میں ہے ابھی
بہارِ سرو سمن کی تلاش میں ہے ابھی

اُڑا رہا ہے جنوں میری لاش کے ٹکڑے
نصیب گور و کفن کی تلاش میں ہے ابھی

ابھی ملی نہیں پُرسوز دل کو محفلِ دوست
یہ شمع اپنی لگن کی تلاش میں ہے ابھی

چھپا ہوا ہے کوئی حشر ذہنِ ہستی میں
زمانہ اہلِ فتن کی تلاش میں ہے ابھی

بساطِ لالہ و گُل بچھ رہی ہے ہر جانب
چمن کی روح چمن کی تلاش میں ہے ابھی

ہوا نہ تکملۂ امتحانِ صبر و رضا
جہاں حسینؓ و حسنؓ کی تلاش میں ہے ابھی

ادب میں ہے ابھی امکانِ وسعت اے سیماب
زباں حقیقتِ فن کی تلاش میں ہے ابھی

○
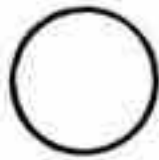
عشق کے رُوپ میں ہم قصدِ تجلّیٰ کرتے
پھر ترے حُسن کو مجبورِ تماشا کرتے

ہم کمالِ نگہِ شوق سے پیدا کرتے
ایسی تصویر جسے آپ بھی دیکھا کرتے

سر جھکانے کے لیے عرش نہ تھا کیا موجود؟
کیا پڑی تھی کہ ترے پاؤں پہ سجدا کرتے

فاش منصور نے دانستہ کیا سرِّ خودسری
ہم تو سر دے کے بھی یہ راز نہ افشا کرتے

تم جو چھوڑ آئے تھے وہ رنگ بھی باقی نہ رہا
تم سے یارانِ قفس ذکرِ چمن کیا کرتے!

غم بہرحال مقدّر تھا، نہ تھی اُس سے نجات
غمِ اُلفت جو نہ ہوتا غمِ دُنیا کرتے

چار آنسو بھی نہ اپنے ہوئے اُن سے برداشت
ہم نے سوچا تھا کہ ہر قطرے کو دریا کرتے

کیوں کیا ترکِ تعلق کا ارادہ سیماب
ابھی کچھ اور غمِ عشق گوارا کرتے

جوشِ وحشت شورشِ سودا سے فرصت ہی نہیں
جاؤں کیا سوئے چمن، صحرا سے فرصت ہی نہیں

فکرِ دنیا کیا کرے عقبیٰ سے فرصت ہی نہیں
بندۂ مجبور کو مولا سے فرصت ہی نہیں

راہِ ساحل کیا کرے پیدا سفینوں کے لیے
ناخدا کو شورشِ دریا سے فرصت ہی نہیں

کیا نظر پھینکوں تجلّی ہائے پنہاں کی طرف
مجھ کو سیرِ جلوۂ پیدا سے فرصت ہی نہیں

ذکر میرا جلوہ گاہِ دوست کے ساتھ آئے کیا
واقعاتِ طور کو موسیٰ سے فرصت ہی نہیں

بے خودی کم ہو تو دل ہو مائلِ کیفِ خودی
آدمی کو ساغر و مینا سے فرصت ہی نہیں

ہائے وہ وعدہ کہ دنیا سے لگائیں گے نہ دل
وائے مجبوری کہ اب دنیا سے فرصت ہی نہیں

حشر کے ہنگامہ دور از نظر پر کیا ہو غور
زندگی کے فتنۂ برپا سے فرصت ہی نہیں

کیا کرے گا وہ توجہ کاروبارِ عشق پر
عشوہ ہائے حُسن بے پرواسے فرصت ہی نہیں
عشق سے سرشاریٔ امروز کا پیغام لے
عقل کو اندیشۂ فرداسے فرصت ہی نہیں
کیا ملے موقع خُدا کی یاد کرنے کے لیے
بندۂ مزدور کو آقا سے فرصت ہی نہیں
وہ مرے ذوقِ تپش سے کیوں کریں دلسوزیاں
بجلیوں کو وادیٔ سینا سے فرصت ہی نہیں
اب ہے میرا عالمِ بالا پہ ناحق انتظار
اب مجھے ہنگامۂ دنیا سے فرصت ہی نہیں
نیستی پر پہلے قابو ہو تو ہو ہستی کی فکر
ذکرِ الّا کیا کروں میں "لا" سے فرصت ہی نہیں
یہ ملا سیماب عزمِ ترکِ دُنیا کا صلہ
اب مجھے دنیا و مافیہا سے فرصت ہی نہیں
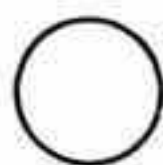
رہیں گے چل کے کہیں اور اگر یہاں نہ رہے
بلا سے اپنی، جو آباد گلستاں نہ رہے
ہم ایک لمحہ بھی خوش زیرِ آسماں نہ رہے
غنیمت اس کو سمجھیے کہ جاوداں نہ رہے
ہمیں تو خود چمن آرائی کا سلیقہ ہے
جو ہم رہیں تو گلستاں میں باغباں نہ رہے
شباب نام ہے دل کی شگفتہ کاری کا
وہ کیا جوان رہے جس کا دل جواں نہ رہے
حرم میں دَیر و کلیسا میں خانقاہوں میں
ہمارے عشق کے چرچے کہاں کہاں نہ رہے
کبھی کبھی رہے وابستگیِ قفس سے بھی
رہے چمن میں تو پابندِ آشیاں نہ رہے
فضائے گل ہے نظر کش وُہ مُن ہے دامن کش
کہاں رہے ترا آوارہ سر کہاں نہ رہے
بہار جن کے تبسم میں مُسکراتی تھی
وہ گلستاں وہ جوانان گلستاں نہ رہے

خُدا کے جاننے والے تو خیر کچھ تھے بھی
خُدا کے ماننے والے بھی اب یہاں نہ رہے
ہمیں قفس سے کریں یاد پھر چمن والے
جب اور کوئی ہوا خواہِ آشیاں نہ رہے
کیا بھی سجدہ تو دل سے کیا نظر سے کیا
خدا کا شکر کہ ہم بارِ آستاں نہ رہے
ہے عصرِ نَو سے یہ اک شرطِ انقلاب کے بعد
ہم اب رہیں جو زمیں پر تو آسماں نہ رہے
براہِ راست تعلق تھا جن کا منزل سے
وہ راستے نہ رہے اب وہ کارواں نہ رہے
ہمیں خرابِ ضعیفی نہیں ہوئے سیماب
ہمارے وقت کے اکثر حسیں جواں نہ رہے
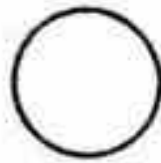
بھلا ہم ذکر و فکرِ غیر کا الزام لیتے ہیں؟
تمہارے نام لیوا ہیں تمہارا نام لیتے ہیں

حیات انگیز انگڑائی پسِ ہر گام لیتے ہیں
کہیں مردانِ میدانِ طلب آرام لیتے ہیں

دماغ و ذہن کو دل کو بنا کر جام لیتے ہیں
لیا جاتا ہے جتنا بادۂ الہام لیتے ہیں

ہم اپنے سر کہاں اچھا برا الزام لیتے ہیں
مقدر خود بناتے ہیں خدا کا نام لیتے ہیں

حرم میں سر جھکا کر جو خدا کا نام لیتے ہیں
صنم خانوں میں لطفِ جلوۂ اصنام لیتے ہیں

سلامِ شوق لیتے ہیں نہ وہ پیغام لیتے ہیں
بڑے خوددار ہیں خودداریوں سے کام لیتے ہیں

نگاہِ دوررس پر بارشِ انوار ہوتی ہے
سوادِ شام سے ہم صبح کا پیغام لیتے ہیں

سر آغازِ محبت سے ابھی سیری نہیں لیکن
ترے اصرار سے ہم دعوتِ انجام لیتے ہیں

چھپا رکھتے ہیں اربابِ وفا ناکامیاں اپنی
باالآخر پھر انھیں ناکامیوں سے کام لیتے ہیں

سہارا جب غمِ تنہائی میں ہم کو نہیں ملتا
تری تصویر کا گھبرا کے دامن تھام لیتے ہیں

سمجھتے ہیں مجھے مل جائے گا نعم البدل اس کا
شکستِ دل کے معنیٰ وہ شکستِ جام لیتے ہیں

جو بن میں گو نجتے ہیں چہچہاتے ہیں گلستاں میں
یہ سب اپنی زبانوں میں خدا کا نام لیتے ہیں

محبت کیا کروں، یہ حالِ آغازِ محبت ہے
کوئی کہتا نہیں، ہم ذمّۂ انجام لیتے ہیں

دلِ صد پارہ سے صد گونہ ہمت بڑھ گئی اپنی
کہ جب اک کام لیتے تھے تو اب سو کام لیتے ہیں

ابھی تک ہے وہ رنگینی مری شامِ محبت میں
مصوّر آ کے تصویرِ چراغِ شام لیتے ہیں

رسا دستِ تصوّر جب ترے دل تک نہیں ہوتا
تو ہم اپنا ہی دل ہاتھوں سے اپنے تھام لیتے ہیں

تماشائے حُسن کی یہ جلوہ سامانی جبھی تک ہے
کہ جب تک ہم محبت کی نظر سے کام لیتے ہیں

جہاں چھڑتا ہے قصہ جلوہ گاہِ طورو طائف کا
وہاں اہلِ نظر میرے بھی دل کا نام لیتے ہیں

بطورِ خاص، اے لوحِ ازل محفوظ کر لینا
یہ مجبوری کہ ہم تقدیرِ غمِ انجام لیتے ہیں

زبانِ ناخلف پر عظمتِ اسلاف کے قصّے!
کہیں بدنام بھی نام آوروں کے نام لیتے ہیں
تری درگاہ کے گوشے میں دب کر بیٹھنے والے
جب اُٹھتے ہیں تو دامانِ ثریا تھام لیتے ہیں
ہمارے دل پہ بارش کیف کی سیماب ہوتی ہے
تکلف بر طرف، ہم بادۂ بے جام لیتے ہیں

○
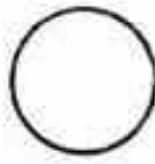
گیا وہ دورِ گیرائیٔ داماں و گریباں کا
جنونِ غم کو اب دل ڈھونڈنا پڑتا ہے انساں کا
مسلسل اس پہ چھڑکا جا رہا ہے خونِ انساں کا
بہت رنگیں ہے مستقبل، زمینِ بزمِ امکاں کا
غمِ آزادیٔ گلشن سکوں ہے اہلِ زنداں کا
خلش بھی اس کی رنگیں ہے یہ کانٹا ہے گلستاں کا
مری نظروں میں ہے اک سلسلہ گورِ غریباں کا
مجھے معلوم ہے، ہونا ہے جو انجام انساں کا
میں زنداں میں ہوں منظر ہے تصور میں گلستاں کا
کوئی ہے روکنے والا مری فکرِ خراماں کا
مسادی مجھ کو عالم دیکھنا ہے بزمِ امکاں کا
مٹانا چاہتا ہوں فرق گلزار و بیاباں کا
کہیں وحشی نہ کردے مجھ کو یہ الجھاؤ عرفاں کا
خدا کو ڈھونڈتا ہوں کھوج مل جاتا ہے انساں کا
یہی تو معجزہ ہے انقلابِ دیرساماں کا
نہ بدلا رنگ لیکن دل بدل ڈالا گلستاں کا

یہاں بربادیوں کے بعد بھی ممکن ہے آبادی
ہو کیوں مغموم جو مفہوم سمجھے بزمِ امکاں کا
نکل ہی آئے گا اک دن سُراغِ راہِ آزادی
کہیں تو ختم ہوگا سلسلہ دیوارِ زنداں کا
زمیں کا ذرّہ ذرّہ جلوہ گاہِ عامِ فطرت ہے
جہاں جھک جائے سر اس کا وہیں کعبہ ہے انساں کا
نہ تعبیر اس کی آساں ہے نہ تفصیل اس کی ممکن ہے
یہ ہستی اک پریشاں خواب ہے وہ بھی پریشاں کا
جو یہ خلوت عطا ہوگی تو یکسوئی سوا ہوگی
مجھے تکلیف کیا ہوگی کہ میں خوگر ہوں زنداں کا
ابھی محروم ہوں میں نغمۂ سازِ حقیقت سے
ابھی پیدا کہاں ہے چھیڑنے والا رگِ جاں کا
ہوا پر بھیجتا ہوں رات دن پیغامِ آزادی
پیمبر بن گیا ہے ذرّہ ذرّہ خاکِ زنداں کا
جمالِ ماسوا کی جستجو ہے نوعِ انساں کو
کیا ہے تجزیہ کس نے تجلّیاتِ انساں کا
جسے تو سایۂ چترِ کلاہ و تاج سمجھا ہے
یہ اک سایہ ہے دیوانے تری عمرِ گریزاں کا
جھلکتا ہے مری صورت سے آبِ رنگِ آزادی
مجھے کیا خوفِ رسوائی کہ میں یوسف ہوں زنداں کا
دکھاؤں کیا تجھے ہُو، خانۂ خاطر کی ویرانی
کبھی راتوں کو جا کر دیکھ سناٹا بیاباں کا

مُبارک فرصتِ آسودگی دورِ حوادث کو
کہ اب انسان کے منہ لگ گیا ہے خونِ انساں کا
کھلائے گا کوئی تازہ شگوفہ یں نہ کہتا تھا
یکایک چاندنی راتوں میں کھل جانا گلستاں کا
قدم جب کاروان کے جانبِ منزل نہیں اُٹھتے
گلے کے ساتھ دل بھی بیٹھ جاتا ہے حدی خواں کا
خدا کی معرفت تو اک طرح کا وہم باطل ہے
ابھی حاصل نہیں انسان کو عرفان انساں کا
یں جب چاہوں گا اک جھٹکے یں اس کو توڑ ڈالوں گا
کوئی رشتہ نہیں ہے پاؤں سے زنجیرِ زنداں کا
نہیں تعمیر یا تخریب اصلِ مقصدِ ہستی
نشاطِ زندگی بھی حصّہ فطری ہے انساں کا
نظر اوپر اُٹھا دیوارِ بے دَر کھینچنے والے
فلک کیا عرش تک رستہ کھلا ہے میرے زنداں کا
ہم آہنگیِ فطرت کا نتیجہ دیکھیے کیا ہو
ہزاروں سازِ تاروں کے اور اِکتارا رگِ جاں کا
گزر جانے دو سیلابِ حوادث کو بہ آزادی
کشادہ راستوں یں زور گھٹ جاتا ہے طوفاں کا
چتا کے چند شعلے اور کچھ شمعیں مزاروں کی
گذرگاہِ فنا یں روز میلہ ہے چراغاں کا
نشاطِ فکر کا سیماب اب موقع نہیں ملتا
غزل کیا ایک دفتر ہے خیالاتِ پریشاں کا

سنہ ۱۹۴۴ء

○

قبول ایک بھی سجدہ مرا یہاں نہ ہوا
حریم عرش ہوا، تیرا آستاں نہ ہوا

وہ ایک قطرۂ خوں آبروئے دامن ہے
جو اشک بن کے گرا اور رائیگاں نہ ہوا

زمیں کی گود میں مٹی مری امانت ہے
میں رائیگاں بھی ہوا اور رائیگاں نہ ہوا

ہوس کدوں میں دیے حُسن کو ہوس نے فریب
نظر کے ساتھ کہیں دل کا امتحاں نہ ہوا

نہ خُلد اپنا ٹھکانہ، نہ مستقر دنیا
کوئی ہماری طرح بھی رواں دواں نہ ہوا

بجائے خود مری ہستی تھی اک نیا رومان
ہزار شکر کہ میں زیبِ داستاں نہ ہوا

دبی دبائی سی اک راکھ تھا دلِ سوزاں
تمام عمر جلا ایک دن دھواں نہ ہوا

صدا وہ ہے کہ جو دل سے نکل کے دل ڈھونڈے
وہ نغمہ کیا ہے جو مضرابِ سازِ جاں نہ ہوا

فتادگی میں مری، تھی شگفت فطرت کی
کہ میں مزاجِ چمن پر کبھی گراں نہ ہوا
فنا کا مقصدِ تخریب ہوگیا پورا
اور ایک ذرّۂ ہستی بھی رائیگاں نہ ہوا
کرے گا رازِ حقیقت کا کس طرح ادراک
یہ آدمی کہ جو اپنا بھی رازداں نہ ہوا
مری رجز نے ارادوں میں بجلیاں بھر دیں
سبک خرام کبھی میرا کارواں نہ ہوا
قفس کی تنگ دلی کا ہو اُس کو کیا احساس
جسے نصیب کبھی عیشِ آشیاں نہ ہوا
نظامِ عالمِ ہستی میں کوئی عیب نہیں
ذرا سا نقص یہی ہے کہ جاوداں نہ ہوا
رفیقِ راہ رہا حُسنِ چارسو سیماب
بخیر طے ہوئی منزل، سفر گراں نہ ہوا

○
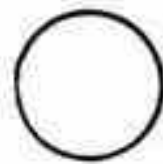
حالانکہ حالِ دل کا کوئی رازداں نہ تھا
لیکن ہمارا ذکرِ محبت کہاں نہ تھا
غم بھی جہاں میں باعثِ تسکینِ جاں نہ تھا
تھا دیر یا ضرور مگر جاوداں نہ تھا
اللہ رے انقلابِ چمن بعدِ انقلاب
تھا آشیاں وہاں بھی جہاں آشیاں نہ تھا
منزل کو ہم بنا نہ سکے میرِ قافلہ
اتنا دراز سلسلۂ کارواں نہ تھا
یوں مطمئن تھا میں دمِ تعمیرِ آشیاں
جیسے مری زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
مدِ نظر تھا جلوۂ ہر سُو کا احترام
سجدہ کیا وہاں بھی جہاں آستاں نہ تھا
باقی رہی چمن میں اسیرِ دل کی یادگار
تھی آشیاں کی خاک جہاں آشیاں نہ تھا
کرتا زمیں پہ مہر و محبت کی بارشیں
اتنا بلند حوصلۂ آسماں نہ تھا

منزل پہ ہوں تو مرکزِ منزل پہ ہے مقام
جب کارواں میں تھا تو بسِ کارواں نہ تھا
ڈھونڈا گیا تو کچھ بھی نہ نکلا سوائے غم
عاشق کا دل تھا کیسۂ بازی گراں نہ تھا
جب یاد آئی، نالہ کیا، سر جھکا دیا
راہِ وفا میں وقتِ نماز و اذاں نہ تھا
اللہ رے ہوائے دلِ افزائے راہِ دوست
بھاری مرے قدم تھے، مگر سرگراں نہ تھا
قبلِ خزاں کہاں تھا نشیمن — یہ کیا کہا
یہ پوچھ ہم نشیں کہ نشیمن کہاں نہ تھا
جو آج کل ہے گردشِ لیل و نہار سے
پہلے یہ حالِ شاعرِ ہندوستاں نہ تھا
تاراج کیوں کیا اسے اے فطرتِ چمن
تیری ہی تھی بہار مرا آشیاں نہ تھا
تسکین کے وجود پر احباب میں تھی بحث
سیماب خیریت یہ ہوئی، میں وہاں نہ تھا

○

عرفانِ محبّت ہے تو کر اِس کا یقیں اور
جُز ترکِ ہوس، عشق کا مقصود نہیں اور
سجدہ تو بجز لغزشِ سر کچھ بھی نہیں اور
ہے عجز کا دعویٰ تو جُھکا دل کی جبیں اور
دیکھی تھی ازل میں کوئی دُنیائے حسیں اور
جانا تھا کہیں اور نکل آئے کہیں اور
میری یہ دُعا۔ دل ہو عطا سوز گزیں اور
فطرت کا یہ ارشاد کہ ممکن ہی نہیں اور
ثابت یہ ہوا جلوہ گیِ سبزہ و گُل سے
اک عالمِ رنگیں ہے نہاں زیرِ زمیں اور
باقی ہے ابھی تشنگیٔ رُوح بدستور
ساقی کی جگہ ہو کوئی مے خانہ نشیں اور
کیا مجھ کو قرار آئے جہانِ گزراں میں
آثار یہ کہتے ہیں کہ منزل ہے کہیں اور
میں نے شبِ غم جن کو سمیٹا تھا بمشکل
وہ تیرگیاں بعدِ سحر پھیل گئیں اور

بیٹھا ہوں سرِ بُت کدہ، دنیا کو لُٹا کر
شاید نکل آئے کوئی غارت گرِ دیں اور

ہے غور طلب عشق کی پستی و بلندی
آئینِ نظر اور ہے دستورِ جبیں اور

کیوں گلشن و صحرا پہ ہے ہنگامۂ تعمیر
دنیا میں بکثرت ابھی خالی ہے زمیں اور

محدود ہے دنیا کی نظر دَیر و حرم تک
ہیں اور کہیں، میری نگاہیں ہیں کہیں اور

سجدوں کی فزائش ہے نوازش کی کمی سے
تم پاؤں ہٹاتے ہو تو بڑھتی ہے جبیں اور

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے دنیا کی خرابی
اُس پہ یہ قیامت، ابھی رہنا ہے یہیں اور

آسودۂ منزل ہوئے سب ہم سفر اپنے
باقی ہیں گذرگاہِ محبت میں ہمیں اور

یں حوصلوں سے یوں شبِ غم کاٹ رہا ہوں
جیسے کوئی بعد اس کے مصیبت ہی نہیں اور

اب دور نہیں سیرِ جہانِ پسِ پردہ
ہوں منتظرِ یک نفسِ باز پسیں اور

ہم طور پہ صدیوں سے نظر پھینک رہے ہیں
شاید ترے پاس اب کوئی جلوہ ہی نہیں اور

یں صاحبِ سجادۂ جبریل ہوں سیماب
اب میرے سوا کوئی نہیں سدرہ نشیں اور

○

الٰہی جادۂ تخییل میں یہ کیا مقام آیا
کہ ہر ہر گام پر روح القدس بہرِ سلام آیا
چمن میں پھر نہ کوئی ضامنِ امن و سلام آیا
وہی تھا انقلابِ وقت، جب میں زیرِ دام آیا
خدا کا ہاتھ بن کر انقلابِ تیز گام آیا
مبارک ہو چمن والو کہ وقتِ انقلاب آیا
ترے کیا کام طوف و سجدۂ بیت الحرام آیا
گیا بن کر غلام اور واپس آیا تو غلام آیا
طریقِ بے خودی میں ایک ایسا بھی مقام آیا
کہ جب اُن کو پکارا، لب پر اکثر اپنا نام آیا
کمالِ محویت ہے، محو ہو کر حُسن بن جانا
وہ کیا آیا جو اُن کی انجمن سے ناتمام آیا
مرے اِس کیفِ محرومی پہ لاکھوں میکدے صدقے
کہ میں ساقی کی محفل میں گیا اور تشنہ کام آیا
سحر ہوتے ہی جن پھولوں سے لُوٹی تازگی تو نے
کبھی اُن کی اُداسی دیکھنے بھی وقتِ شام آیا؟

بنائے بر بنائے تجربہ، میں نے نئے رستے
مرا ناکام ہونا جادۂ الفت میں کام آیا
محبت تھی ازل کی صبح کا اک نورِ خوابیدہ
مگر لینے لگی انگڑائی جب انساں کا نام آیا
نہ آئی کام اگر دنیا مرے، پروا نہیں مجھ کو
یہ کیا کم کامیابی ہے کہ میں دنیا کے کام آیا
مجھے منزل پر اب کیا ڈھونڈتے ہیں قافلے والے
وہی تو میری منزل تھی میں جس منزل میں کام آیا
بسا اوقات محویت میں یوں محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے اب وہ آئے، اب کوئی اُن کا پیام آیا
تمھارا سنگِ در یوں ہو گیا تقسیم سجدوں میں
بچا تعمیرِ کعبہ سے تو بُت خانے کے کام آیا
وہ اے سیماب کہتے پڑھ رہے تھے مرنے والوں کے
لب اُن کے تھرتھرا کر رہ گئے جب میرا نام آیا

○
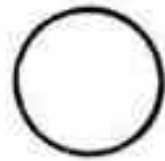
سر جو ٹھکرایا تو شاید یہ کوئی انداز تھا
ورنہ ہر سجدہ مرا تسکینِ پائے ناز تھا
موسمِ گل میں گلستاں کا عجب انداز تھا
تھیں بہاریں نغمہ گر، دستِ جنوں میں ساز تھا
جب بلندی پر تصور مائلِ پرواز تھا
عالمِ ہستی کا ہر عالم نظر انداز تھا
جس کو اِس دنیا نے سمجھا انتہائے بے کسی
وہ تو میرے ابتلائے عشق کا آغاز تھا
حُسن کو بھی تھی نہ گنجائش تجلّی کی وہاں
عشق خود جن آئینہ خانوں میں جلوہ ساز تھا
بے پر و بالی میں بھی کرتا رہا تدبیرِ سَیر
چُپ پڑا رہنا خلافِ ہمّتِ پرواز تھا
نزع کے خاموش لمحوں میں نہ رہنا تھا خموش
بے خبر وہ ہی تو وقتِ انکشافِ راز تھا
مرے صحرائے محبّت کی نمو کاری نہ پوچھ
اِس خراب آباد کا ہر ذرّہ عالم ساز تھا

موسمِ گل میں بہاروں نے جو باندھی تھی ہوا
میں ہی کیا سارا گلستاں مائلِ پرواز تھا
عشق نے نالوں کے پیرائے میں نغمے بھر دیے
پہلوئے انساں میں دل اک سازِ بے آواز تھا
عمر بھر جس نے نہ مجھ کو چین سے سونے دیا
وہ مرے خوابِ لحد میں بھی خلل انداز تھا
اختلافِ حال سے تھا دل امینِ سوز و ساز
جل اُٹھا تو سوز تھا، گانے لگا تو ساز تھا
اب حقیقت کھُل گئی تو اس سے دل بیزار ہے
رنگِ ہستی تھا بہت دلچسپ جب تک راز تھا
اب ہے اک مدت سے خون و خاک میں لتھڑی ہوئی
آدمیت جس پہ نوعِ آدمی کو ناز تھا
بارِ غم سے آج ہی کیا نبضِ دنیا سُست ہے
اس سے پہلے بھی مزاجِ زندگی ناساز تھا
ختم جس پر بزمِ ہستی کی کہانی ہو گئی
وہ ہماری داستاں کا نقطۂ آغاز تھا
کس طرح دونوں میں بنتی، کس طرح ہوتا نباہ
عشق دنیا سوز تھا اور حُسن دنیا ساز تھا
اہلِ دل کے دل پر اے سیماب کیا کرتا اثر
بے دلی کا شعر گویا نغمۂ بے ساز تھا

○

دل اکثر شکریہ سنجِ جفائے یار ہوتا ہے
محبت کرنے والوں کا یہی کردار ہوتا ہے!؟
ازل کے خوابِ کیف انگیز سے سرشار ہوتا ہے
بڑی مشکل سے ذہنِ آدمی بیدار ہوتا ہے
مزاجِ حُسن جب خو کردۂ پندار ہوتا ہے
تو "دل آزار" ہی کیا "زندگی آزار" ہوتا ہے
دلِ اہلِ نظر قبلِ سحر بے دار ہوتا ہے
یہی وقتِ کشودِ پردۂ اسرار ہوتا ہے
مجھے آتی ہے غیرت دَیر اور کعبے کے قصوں پر
کہ جھگڑا بر بنائے آستانِ یار ہوتا ہے
گراں ہوتی نہیں، ہو کوئی کیفیت محبت کی
وہ غم، غم ہی نہیں ہوتا جو دل پر بار ہوتا ہے
وفا کا نام لے، یا ذکر کر عجزِ محبت کا
بہر صورت غرورِ عشق کا اظہار ہوتا ہے
وہاں تمیزِ حُسن و عشق ہو سکتی ہے مشکل سے
جہاں فرقِ جنون و ہوش بھی دشوار ہوتا ہے

معاذ اللہ، ہیجانِ اسیری موسمِ گُل میں
چمن کا ذرّہ ذرّہ انقلاب آثار ہوتا ہے

کیا جاتا ہے برسوں خونِ شب ہائے مسرّت کا
بڑی مشکل سے پیدا اک دلِ بیدار ہوتا ہے

اک ایسا نازک آ جاتا ہے لمحہ موسمِ گُل میں
کہ بال و پَر کا سایہ بھی چمن پر بار ہوتا ہے

کبھی قرنوں میں محفل منعقد ہوتی ہے ایمن کی
کبھی صدیوں میں کوئی طالبِ دیدار ہوتا ہے

نظر اُٹھنے پہ مجبور اور سر جھکنے پر آمادہ
عجب عالم قریبِ آستانِ یار ہوتا ہے

مرے اشعار ہی سیماب ہوتے ہیں گراں اُن پر
مجھی سے شعر کہنے کے لیے اصرار ہوتا ہے

○
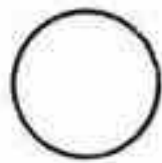
مغنی جاگتی سی اک فضا تیار ہو جائے
رجز خواں ہو کہ روحِ انجمن بیدار ہو جائے
خوشامد ناخدا کی اور طوفاں سے جھجکنا کیا
لگا جھنجھلا کے وہ ٹھوکر کہ بیڑا پار ہو جائے
ورودِ زندگی ہوگا انھیں قربان گاہوں میں
ذرا ہٹ جائیں لاشیں، راستہ ہموار ہو جائے
وہ فتنہ محو کر دینے، مٹا دینے کے قابل ہے
جو دانستہ مزاجِ زندگی پر بار ہو جائے
خزاں آئی ہے اب کے پیرہن میں موسمِ گل کے
چمن والے سمجھ جائیں، چمن ہشیار ہو جائے
مرے قابو میں آجائے اگر تارِ رگِ ہستی
وہ جھٹکا دوں کہ سازِ دو جہاں بیکار ہو جائے
گراں خوابیٔ تربت سے بھی جی گھبرا گیا اب تو
قیامت ہو نہ ہو، سرکار کا دیدار ہو جائے
مجھے اے انقلابِ وقت اسی دنیا میں رہنا ہے
نہ چھیڑ اتنا کہ دنیا ہی سے دل بیزار ہو جائے
پھر اے سیماب مایوسی کا اُس کی کیا ٹھکانہ ہے
جسے مرنا بھی جینے کی طرح دشوار ہو جائے

دل پھونک کے جلوہ گہِ جانانہ بنادے
اک طور بہ اندازِ کلیمانہ بنادے
معمورۂ عالم ہمہ رنگ و ہمہ بو ہے
منشائے بشر یہ ہے کہ ویرانہ بنادے
محدود ہے فطرت کا جمال اپنی حدوں میں
بڑھ جائے تعین سے تو دیوانہ بنادے
تو برق بھی ہے، نور بھی ہے رنگ و نمو بھی
کچھ مجھ کو بھی اے جلوۂ جانانہ بنادے
کیا اس کا بھروسہ ہے کہ دنیا ہے یہ دنیا
چاہے تو حقیقت کو بھی افسانہ بنادے

بیٹھا ہوں چاک جیب و گریباں کیے ہوئے
ہنگامۂ بہار کا ساماں کیے ہوئے
ہوں اپنے بس میں عالمِ امکاں کیے ہوئے
اپنی خودی کو اپنا نگہباں کیے ہوئے
اے دوست اب تو آ۔ کہ زمانے گزر گئے
جلوؤں سے انجمن میں چراغاں کیے ہوئے

ق

ہستی ہے اک جنونِ تباہی کی منتظر
صحرا کی وُسعتوں کو گریباں کیے ہوئے
خوش ہوں کہ آرہا ہے نیا دَورِ انقلاب
ذرّوں کو غیرتِ مہِ تاباں کیے ہوئے
موجوں کو سیل بننے کا دیتا ہوا سبق
قطروں کو فرطِ جوش سے طوفاں کیے ہوئے
صیّاد پھر رہے اہلِ چمن کی تلاش میں
دشنہ حجابِ دام میں پنہاں کیے ہوئے
سازِ بہار ہے نئے عنوان و رنگ سے
اپنی خموشیوں کو غزل خواں کیے ہوئے

گلچیں کھڑے ہوئے روشوں پر ہیں صف بصف
اندیشہ ہائے تنگیٔ داماں کیے ہوئے
ہے فطرتِ چمن بہ ہر انداز مطمئن
نظمِ جدید صبحِ بہاراں کیے ہوئے
احساس لازمی تھا کہ صدیاں گزر چکیں
شیرازۂ حیات پریشاں کیے ہوئے
اب کوہ و دشت و باغ و دمن آئیں گے نظر
رنگ اور بو کو دولتِ داماں کیے ہوئے
اب آشیاں میں آئیں گے سب اہلِ آشیاں
سامانِ جشنِ غارتِ زنداں کیے ہوئے
رنگ و نوا و امن و سکون و شگفت کا
گلزار اور بہار سے پیماں کیے ہوئے
القصہ انقلاب کے پردے میں ہے خدا
عزمِ نشاط مندی انساں کیے ہوئے
سیماب عہدِ گل کی ہے تجدید۔ اور میں
بیٹھا ہوں چاک جیب و گریباں کیے ہوئے

نہ ہو جو خود شناس، اُس کا شناسا ہو نہیں سکتا
کہ بے خود آگہی، عرفان پیدا ہو نہیں سکتا
مرا دل مائلِ ماہ و ثریا ہو نہیں سکتا
جو پیدا ہو کے چھُپ جائے وہ جلوا ہو نہیں سکتا
جو نظارہ بہ اندازِ گوارا ہو نہیں سکتا
تو ذوقِ دید مجبورِ تماشا ہو نہیں سکتا
وقارِ عشق کی غایت سے محروم ہو چکا ہوں میں
غرورِ حُسن اب مجھ سے گوارا ہو نہیں سکتا
یہ باور کر۔ کہ تیرا سر بپائے ناز پراُن کے
نہ ہو مسجود اگر موجود۔ سجدا ہو نہیں سکتا
ابھی جلوہ نُما ہو جا۔ اگر عزمِ تجلّی ہو
کہ بس سرگشتۂ امروز و فردا ہو نہیں سکتا
سمجھتا ہوں کہ نصب العین ہستی بے نہایت ہے
مجھے منزل پہ بھی منزل کا دھوکا ہو نہیں سکتا
نظر میں شوق، دل میں ذوقِ بیعد کی ضرورت ہے
جو کوہِ طور پر چڑھ جائے، موسیٰ ہو نہیں سکتا

وہاں صورت پرستی ہے، یہاں انکار کی صورت
کلیسا دَیر ہو سکتا ہے، کعبا ہو نہیں سکتا
اصولاً کیوں ہمیں تشویش ہو انجامِ دُنیا کی
ہمارے سامنے انجامِ دنیا ہو نہیں سکتا
غبارِ کارواں خود ہی حجابِ نور و ظلمت ہے
اُڑے کتنی ہی مٹّی۔ چاند پھیکا ہو نہیں سکتا
کسی نزدیک تر منزل سے دو مجھ کو ثبوت اپنا
یقیں بھی اب عقیدت کا سہارا ہو نہیں سکتا
محبت لے کر آئے، حُسن جب میرے قریب آئے
فقط صورت سے میرا ذوق پورا ہو نہیں سکتا
فروغِ حُسن د سوزِ عشق نے اس کو جَلایا ہے
ابھی صدیوں چراغِ طور ٹھنڈا ہو نہیں سکتا
یہ منصب مل گیا ہے دائماً سیماب شاعر کو
پیمبر اب کوئی دُنیا میں پیدا ہو نہیں سکتا

○
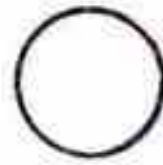
بقیدِ وقت، یہ مژدہ سُنا رہا ہے کوئی
کہ انقلاب کے پردے میں آ رہا ہے کوئی

خودی کو راہِ خدائی پہ لا رہا ہے کوئی
ابھی دماغِ بشر آزما رہا ہے کوئی

جہاں خرابۂ ہستی مٹا رہا ہے کوئی
وہیں کہیں نئی دُنیا بنا رہا ہے کوئی

ابھی نقاب کشائی حُسن ہے دشوار
وہی اُٹھے ہوئے پردے اُٹھا رہا ہے کوئی

جو ذہن میں ہے وہ تصویر بن نہیں سکتی
بنا بنا کے ہیولے، مٹا رہا ہے کوئی

بُھلا رہا ہے کسی کو، تو بر بنائے مآل
یہ غور کر کر بھُلایا بھی جا رہا ہے کوئی

دلِ فسردہ کی باتوں پہ یہ تبسمِ ناز!
کلی کو پھول بنانا سکھا رہا ہے کوئی

وفا کی داد ہے کوتاہیٔ وفا کی دلیل
میں جانتا ہوں کہ ہمت بڑھا رہا ہے کوئی

حدیثِ کہنہ ہے رودادِ انقلابِ چمن
سُنی ہوئی سی کہانی سنا رہا ہے کوئی

مری وفاؤں کا ہے اعتراف میرے بعد
خوشا نصیب مجھے کھو کے پا رہا ہے کوئی

ہے اپنے سائے سے وحشت میں کس قدر تسکیں
سمجھ رہا ہوں مرے ساتھ آ رہا ہے کوئی

نصیبِ ذوق ہو سیماب قسمتِ موسیٰ
ہمیں بھی طور کی جانب بُلا رہا ہے کوئی

○
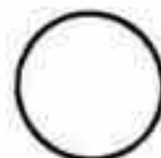
محفلِ عالم میں پیدا برہمی ہونے لگی
زندگی خود ہی حریفِ زندگی ہونے لگی

سعیٔ تجدیدِ جُنونِ عاشقی ہونے لگی
یاد بھی ہونے لگی، فریاد بھی ہونے لگی

شرم سے آنکھیں جھکا دیں احتیاطِ ضبط نے
جب نظر بھی ترجمانِ بےکسی ہونے لگی

دشتِ ایمن میں چراغِ طور ٹھنڈا ہو گیا
جلوہ گاہِ دل میں جب سے روشنی ہونے لگی

جب سرابِ آرزو کا تجزیہ میں کر چکا
نامرادی سے مجھے تسکین سی ہونے لگی

قسمتِ دہقاں میں عشرت مندیٔ حاصل کہاں
بجلیاں لہرائیں جب کھیتی ہری ہونے لگی

ڈال دے گی مصلحت، پردے شگفتِ حال پر
اُن پہ ظاہر کیوں مری افسردگی ہونے لگی

کارواں کو آگیا پھر ہوش، پھر ٹوٹا جمود
عادتاً پھر کوششِ منزل رسی ہونے لگی

خلد زاروں سے جوانی کے، مُڑی راہِ حیات
ختم اب اس رہگذر کی دل کشی ہونے لگی

عالمِ نو جانے کس مخلوق سے آباد ہو
آدمی میں آدمیت کی کمی ہونے لگی

میں سمجھتا تھا کہ محکم ہے بنائے آشیاں
یہ تو قبلِ "حملہ"، برباد بھی ہونے لگی

قوت و سرمایہ غالب آگئے جذبات پر
جنگ ہوتے ہوتے جنگِ زرگری ہونے لگی

خود ہی برہم نظمِ دنیائے خودی ہونے لگا
کارگر میری نوائے بے خودی ہونے لگی

اے جمودِ وقت اتنی بھی تن آسانی نہ دے
اب تو دو پھر صبح کی انگڑائی بھی ہونے لگی

شدّتِ ذوقِ نظر سے حُسن دبتا ہی رہا
جب کوئی موسیٰ ملا، جلوہ گری ہونے لگی

بعد مدّت آئے پھر کاشی میں لے سیمابؔ ہم
یاد تازہ دل میں آغا حشرؔ کی ہونے لگی
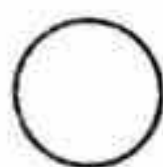
موسیٰ نہیں کہ طور پہ جلنے کو جائیں گے
ہم تو تری نظر پہ نظر آزمائیں گے
کب تک یونہی حجاب کی تہمت اٹھائیں گے
پردے اٹھانے والے، نظر بھی اٹھائیں گے!
میں فطرتاً ہوں ظرفِ تماشا لیے ہوئے
میرے سوا وہ کس کی نظر آزمائیں گے
ہر ذرّۂ چمن ہے ہماری ہی یادگار
جب تک بہار آئے گی ہم یاد آئیں گے
تدبیر آزما ہوں۔ بہ تقدیرِ انقلاب
مجھ کو یقین ہے کہ یہ دن پھر نہ آئیں گے
ہے سایۂ سکوں، تپشِ غم کے ساتھ ساتھ
پھیلی ہوئی ہے دھوپ تو بادل بھی چھائیں گے
ہوں دُور آشنا، مری پرواز ہے بلند
دھوکے حیات کے مجھے چھونے نہ پائیں گے
کر اپنے موج خیز خیالوں کی روک تھام
یہ پھیل جائیں گے تو سمیٹے نہ جائیں گے

اہلِ عزا کے غم کا ہے خود وقت ہی علاج
دو چار دن کی بات ہے، پھر بھول جائیں گے

اک روز کھل ہی جائے گا اُن پر مذاقِ عشق
ہم دل کی بات دل سے کہاں تک چھپائیں گے

اس دَور نے بنائے ہیں جتنے نئے غلام
اتنے کئی صدی میں بنائے نہ جائیں گے

شامِ چمن ہو، یا ہو چراغِ سوادِ طور
دل جن کے ہیں بجھے ہوئے، کیا مسکرائیں گے!

سنتے ہیں اُن کا جلوہ ہے مقسومِ ہر نگاہ
ہم بھی کبھی نصیبِ نظر آزمائیں گے

ہے رہروانِ جادۂ ہستی سے کیوں غبار
اس راستے میں پھر یہ مسافر نہ آئیں گے

یہ حکم ہے کہ طور پہ آراستہ ہوں دل
وہ آج اپنی تابِ نظر آزمائیں گے

دل ہے چراغِ خانۂ مفلس، نہ توڑ اسے
پھر غم کی رات آئی، تو ہم کیا جلائیں گے

نطقِ کلیم سے ہوئی بیدار شمعِ طور؟
سیماب ہم بھی تابِ سخن آزمائیں گے

سیماب، ہے زبانِ ادب رحلتِ آثرؔ[1]
شاید اب ایسے لوگ نہ دنیا میں آئیں گے

[1] فضل الدین آثرؔ اکبرآبادی ایم۔اے۔بی ٹی۔ ۳۰ مئی ۱۹۳۲ء کو بعارضۂ دق عالمِ جوانی میں "بھوالی" میں انتقال ہوا۔
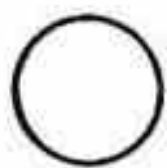
راز آشنائی کا راز آشنا جانے
دل سے جو نہ ہو آگاہ، دل کی بات کیا جانے
اُس کی بے نیازی کا وزن کوئی کیا جانے
جو نہ سیر دامن ہو اور نہ مانگنا جانے
عشق ہے تجاہل کیش، حُسن ہے تغافل خو
میرا ذمہ دارِ غم، کون ہے خدا جانے
جانتا ہے وہ اُس کا رازِ جلوہ پیرائی
جو نگاہ کی حد سے دور دیکھنا جانے
یہ تو میری نظروں نے دلنوازیاں دی ہیں
ورنہ وہ نظر رسمِ التفات کیا جانے
میری ہر نظر سجدہ، میرا ہر نفس تسبیح
اور کس کو کہتے ہیں بندگی، خدا جانے
اس کو دیکھتے ہیں وہ، اُس سے بات کرتے ہیں
جو نہ دیکھنا جانے اور نہ بولنا جانے
حُسن ظن ہے بے معنیٰ سوءظن ہے لاحاصل
کیا مآلِ ہستی ہو، کیا نہ ہو، خدا جانے

جھک گئی جبیں میری رہگذار میں اُس کی
سجدہ تھا کہ سودا تھا' اب یہ نقشِ پا جانے

دل نے مطمئن ہو کر ایک بار اُسے دیکھا
پھر مرا سکونِ دل کیا ہوا' خدا جانے

حُسن رنگ و نور اس میں بھر رہا ہے پیوستہ
کس قدر بھیانک تھی زندگی خدا جانے

اپنی ہی مصیبت کا کم نہیں اُسے احساس
حُسن کیوں فسردہ ہے عشق کی بلا جانے

میں کسی سے دنیا میں آشنا نہیں سیماب
خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے
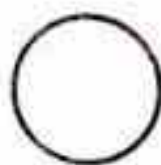
مصیبت کے آنسو، کلیجے کے ٹکڑے، ہیں مظلوم کی زندگی کے سہارے
امیروں کو مَن و سلویٰ مبارک، غریبوں کے بھی ہو رہے ہیں سہارے
سرپا تراب اور یہ بحرِ ہستی، یہ سیلِ حوادث، یہ طوفاں کے دھارے
کہیں مل ہی جائے گا کوئی سفینہ، چلا چل مسافر کنارے کنارے
مبارک رہے اُن کو اپنی تجلّی، سلامت رہیں حُسن کے چاند تارے
ہمیں خود ہی رونا ہے تابِ نظر کا، کہاں کا تماشا، کہاں کے نظارے!
شبِ غم کی ظلمت کو کیا جگمگاؤں، نہ آنکھوں میں آنسو نہ دل میں شرارے
مگر آس باندھے ہوئے یوں پڑا ہوں، کہ جیسے ٹپک ہی پڑیں گے ستارے
یہ انساں خودی کا شکار اللہ اللہ، یہ ہنگامۂ گیر و دار اللہ اللہ
یہ مجبور کا اختیار اللہ اللہ، زمیں پر اجارے، فلک پر اجارے
رہی اُن کی ممتاز جلوہ طرازی، نگاہیں ہماری رہیں امتیازی
برابر رہی حُسن و الفت کی بازی، نہ وہ ہم سے جیتے، نہ ہم اُن سے ہارے
نشاطِ چمن کا کروں حوصلہ کیا، کہ ہے آشیاں کے اُجڑنے کا کھٹکا
ہے مفہوم کچھ اور ابر و ہوا کا، سمجھتا ہوں فطرت کے نازک اشارے
وہ میرے تصوّر کی صدرنگ محفل، صباحت کا مرکز، ملاحت کی منزل
کہیں شامِ رقصاں، کہیں صبحِ خنداں، کہیں ماہ پارے، کہیں مہر پارے

شب و روز اک آگ سی بھر رہے ہیں، چتاؤں کے شعلے، چراغانِ ساحل
کوئی سوزِ ہستی سے خالی نہیں ہے، نہ جمنا کی موجیں، نہ گنگا کے دھارے
جو قوّت ہے خلّاقِ بزمِ جہاں کی، وہی ہے کفیلِ حیاتِ جہاں بھی
جو انساں کو اس کا یقیں ہو تو انساں، نہ پھیلائے ہاتھ اور نہ دامن پسارے
مُرادوں کا مدفن بنا ہی چکے ہیں، ارادوں کی تخلیق بھی روک دیتے
ہمیں بزمِ امکاں میں یہ کیا خبر تھی کہ پورے نہ ہوں گے ارادے ہمارے
حوادث سے کیوں تو نے دامن کشی کی، حوادث سے ہے پرورش زندگی کی
مہمّاتِ ہستی میں ہے جیت اُس کی، جو دم توڑ دے اور ہمّت نہ ہارے
جو یہ انقلابِ زمانہ نہیں ہے، تو پھر انقلاب اور کہتے ہیں کس کو
ہواؤں پہ اُڑتے پھریں خاک زادے، سمندر کی موجوں پہ برسیں شرارے
اگر آشنا کوئی میرا نہیں ہے، تو پھر مجھ سے یہ چھیڑ رہتی ہے کیسی؟
کبھی دل سے آواز آتی ہے ایسی، کہ جیسے کوئی نام لے کر پکارے
غرورِ تجلّی سزاوار تم کو، نہ ہم کو مناسب غرورِ تماشا
یہ سب نعمتیں دی ہوئی ہیں کسی کی، نہ آنکھیں ہماری، نہ جلوے تمہارے
کوئی روز تم بھی بہاریں منالو، ہوا باندھ لو آشیانے سجالو
خدا حافظ اے باغ کے رہنے والو، کہ ہم تو چمن سے قفس کو سدھارے
مجھے خدشۂ مرگ سیماب کیسا! ملی عمرِ خضر و حیاتِ مسیحا
پھر اس کے علاوہ عقیدہ ہے میرا، کہ مرتے نہیں ہیں محبت کے مارے

○

آنکھ سے ٹپکا جو آنسو وہ ستارا ہوگیا
میرا دامن آج دامانِ ثریا ہوگیا

اُس کے جی میں کیا یہ آئی، یہ اُسے کیا ہوگیا
خود چھپا عالم سے اور خود عالم آرا ہوگیا

بندۂ معنی کہاں، صورت کا بندا ہوگیا
سوچتا ہوں، مجھ کو کیا ہونا تھا، میں کیا ہوگیا

پھر تصور نے بڑھا دی نالۂ موزوں کی لے
پھر سوادِ فکر سے اک شعر پیدا ہوگیا

اب کہاں مایوسیوں میں جھلکیاں اُمید کی
وہ بھی کیا دن تھے کہ تیرا غم گوارا ہوگیا

جان دے دی میں نے تنگ آکر وفورِ درد سے
آج منشائے جفائے دوست پورا ہوگیا

برہمن کہتا تھا "برہم" شیخ بول اُٹھا احد
حرف کے اک پھیر سے، دونوں میں جھگڑا ہوگیا

وحدت و کثرت کے جلوے، خلقتِ انساں میں دیکھ
ایک ذرہ اِس قدر پھیلا کہ دُنیا ہوگیا

بربریت کی جہاں میں گرم بازاری ہوئی
آدمیت کی رگوں میں خون ٹھنڈا ہوگیا

آشیاں بننے نہ پایا تھا کہ بجلی گر پڑی
باغ ابھی بسنے نہ پایا تھا کہ صحرا ہوگیا

آگیا سیلاب بالیں تک وفورِ گریہ سے
رحم کر یا رب کہ پانی سر سے اونچا ہوگیا

اتفاقِ وقت تھا اپنا فروغِ آشیاں
جب کوئی جگنو چمک اُٹھا اُجالا ہوگیا

دل کھنچا جتنا قفس میں آشیانے کی طرف
دور اتنا ہی قفس سے آشیانا ہوگیا

ہم مسافر تھے، ہمارا مستقر کوئی نہ تھا
رات جب آئی، جہاں آئی، بسیرا ہوگیا

ہوگئے رخصت، رئیس و عالی و واصف، نثار
رفتہ رفتہ آگرہ سیماب سونا ہوگیا
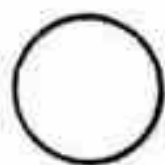
بہت سخت تھا جادۂ عمرِ فانی
بڑی مشکلوں سے کٹی زندگانی
جوانی بھی فانی، بڑھاپا بھی فانی
نہ یہ جاودانی، نہ وہ جاودانی
کہیں کیا حدیثِ نشاطِ جوانی
وہ اک نامکمل، ادھوری کہانی
جو کچھ لائی تھی لے گئی سب جوانی
نہ اب دن سہانے نہ راتیں سہانی
محبت کو اپنی بنا غیرفانی
جو تو جاودانی تو سب جاودانی
کہو باغباں سے کہ قبضہ اٹھالے
ہم اب خود کریں گے یہاں باغبانی
سب آنکھوں کے رستے بہا رفتہ رفتہ
محبت میں جتنا ہوا خون پانی
ہیں محفوظ آثارِ غم دل میں لیکن
خوشی نے نہ چھوڑی کچھ اپنی نشانی

مرا حالِ دل کیا معمہ تھا یا رب
نگاہوں نے کی عمر بھر ترجمانی

قیامت سی برپا ہے صحنِ چمن میں
بہاروں کو آتی نہیں گل فشانی

غرور اور عشوہ گری کے علاوہ
بغاوت بھی ہے اک جنونِ جوانی

بڑھائے چل اپنے قدم اے مسافر
خدا جانے تھک جائے کب زندگانی

جہاں تک سُنی جائے تجھ سے سُنے جا
کہ ہے زندگی اک مسلسل کہانی

میں سیماب تھا ترجمانِ حقائق
کسی نے بھی میری حقیقت نہ جانی

○
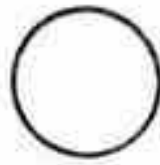
نہ سر میں سودا ہے رہبری کا، نہ دل میں جذبہ ہے رہروی کا
کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ تھک گیا پاؤں زندگی کا
مجھے بھی کچھ تو خیال رکھنا ہی چاہیے اپنی زندگی کا
میں ساتھ دوں گا کہاں تک آخر ترے ملال اور تری خوشی کا
غرور اُس سے گریز اس سے، نہ میں خدا کا نہ آدمی کا
میں باز ایسی خودی سے آیا، اگر نتیجہ یہ ہے خودی کا
تھا اک زمانہ کہ دشمنی بھی، ادائے برہم تھی دوستی کی
مگر میں اس دَور میں ہوں قائل، نہ دوستی کا نہ دشمنی کا
شگفتگی بھی گرفتگی ہی کا ایک عنوانِ مختصر ہے
شگفتہ دل ہو کے کیا کرے گا، مزہ اُٹھا دل گرفتگی کا
میں خود ہوں پابستۂ محبت، مگر مرا فیصلہ یہی ہے
غرض کے بندے ہیں سب جہاں میں، یہاں نہیں ہے کوئی کسی کا
مری تباہی کے ذکر سے وہ، بہت اثر آج لے رہے ہیں
نہ جانے کیا حال ہو جو کہہ دوں کہ ہے یہ سب کام آپ ہی کا
یہ ناچتی کھیلتی سی موجیں، تری کشاکش پہ ہنس رہی ہیں
جو ڈوبنے سے تھی اتنی دہشت، تو کیوں بھرا دم شناوری کا

میں اپنے ہمدرد کا کروں شکریہ ادا کیا، یہ جانتا ہوں
کہ میرے دردِ فتادگی میں، خیال ہے اپنی برتری کا
ملا ہے تجھ کو دلِ شکستہ، تو اور اُسے توڑتا چلا جا
شکست ہو جائے غیر ممکن، کمال یہ ہے شکستگی کا
مرے ارادوں میں، حوصلوں میں، جمود سا ہو گیا ہے پیدا
سپردِ قسمت ہوا ہے جب سے، معاملہ میری بے کسی کا
یہ آدمی ہے وہی کھلاڑی، جو کھیلتا تھا غم و خوشی سے
مگر اسی آدمی کے ہاتھوں، بگڑ گیا کھیل زندگی کا
قدم قدم پر، نفس نفس میں، نظر نظر سے ہوں سجدہ پیرا
جہاں میں کوئی نہیں ہے محرم مرے مقاماتِ بندگی کا
نہ اب وہ باطل کی ترجمانی، نہ اب وہ اسلوب خوش بیانی
مری حقیقت پسندیوں نے بدل دیا رنگ شاعری کا
جہانِ نا قدرداں میں سیماب، قدرِ ہم جنس جانتا ہوں
میں آدمی ہوں اور اِس لیے احترام کرتا ہوں آدمی کا

○
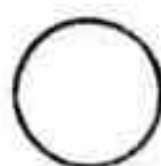
فلک پر چاند چھپتا جا رہا ہے
خیالِ صبح منزل آ رہا ہے
ہوا سنکی ہے بادل چھا رہا ہے
جنوں انگیز موسم آ رہا ہے
کبھی پنہاں کبھی پیدا رہا ہے
مگر جلوہ ترا، جلوا رہا ہے
نہ پوچھ اُس دل سے حالِ عیشِ امروز
جو مجبورِ غمِ فردا رہا ہے
کہاں طور اور کہاں سوز آشنا دل
یہاں برسوں دھواں اُٹھتا رہا ہے
تری خوئے تغافل کا گلہ کیا
محبت میں یہی ہوتا رہا ہے
یہاں جو ہے وہ ہے مجبور و محتاج
یہ تو دامن کہاں پھیلا رہا ہے

نہ کر رُسوا دلِ حُسن آشنا کو
کہ یہ تیرا اسرا پردہ رہا ہے
یقیں رکھ حاصلِ لا حاصلی پر
یہاں جو کھو رہا ہے پا رہا ہے
نگہدارانِ شامِ غم میں باقی
فقط اک صبح کا تارا رہا ہے
تصوّر میں وہ اُن کی غم گساری
کہ جیسے دل کو دل سمجھا رہا ہے
غم اُن کا آئے، بسم اللہ سیماب
مگر اب مجھ میں باقی کیا رہا ہے

○
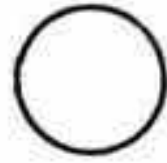
کر اتنا اعتبارِ زندگیٔ جاوداں پیدا
کہ مرگِ ناگہاں سے ہو، حیاتِ جاوداں پیدا
جمودِ مستقل ہے کارواں در کارواں پیدا
کبھی ان بادلوں میں کیا نہ ہوں گی بجلیاں پیدا
محبت یوں کیا کرتی ہے اپنا ترجماں پیدا
زباں خاموش، اندازِ نظر سے داستاں پیدا
خزاں سے سوءِ ظن کرتا ہے ناحق باغباں پیدا
یہ کیا جانے بہاروں ہی سے ہوتی ہے خزاں پیدا
ہمارے خاک ہونے سے ہے نقصِ خاکداں پیدا
وہ کیوں ناپید ہو جائے، جو ہو جائے یہاں پیدا
ہزاروں عظمتیں ہیں دفن، دنیا کے خرابوں میں
زمیں ہر دَور میں کرتی رہی ہے آسماں پیدا
خبر دیتے ہیں پاکوبی کی، تھرّائے ہوئے ذرّے
غبارِ کارواں سے ہے فشارِ کارواں پیدا
قفس سے سلسلہ جس کا ملے چھوڑ آشیاں پیدا
کوئی گھر اور کرلے ماورائے آشیاں پیدا
جھکا لیتے ہیں جب سر ہاتھ پر ہم ذوقِ سجدہ میں
تو کر لیتے ہیں اپنی آستیں میں آستاں پیدا
بجز خورشید و شبنم، کون ہے اس بھید سے واقف
چمن کرتا ہے کس کے خون سے رنگینیاں پیدا

بے مٹے بن بن کے لاتعداد نقشے زندگانی کے
ہوا اب تک نہ لیکن ایک نقشِ جاوداں پیدا
اُدھر دنیا کو منزل جان کر، ہیں مائلِ عشرت
اِدھر ہر سانس سے بانگِ درائے کارواں پیدا
بقیدِ آدمیّت، آدمی بھی اب نہیں ملتا
یہی دنیا ہے وہ، انسان ہوتے تھے جہاں پیدا
غرورِ حُسن کی ٹھوکر سے کہہ دو، ہوش میں آئے
کہ میں حدِّ نظر پر کر رہا ہوں آستاں پیدا
حجابات و مظاہر، سب اسی کی جلوہ گاہیں ہیں
مگر یہ کیا خبر، وہ ہے کہاں پنہاں کہاں پیدا
اندھیرے ہی اندھیرے ہیں بصارت سے بصیرت تک
بہ آسانی نہیں ہوتی نگاہِ رازداں پیدا
نظر کی، دل کی، یا آواز کی تخصیص مشکل ہے
بہ توفیقِ محبّت، درد ہو جائے جہاں پیدا
جو تیری فکر میں گہرائی ہو، ہمّت میں گیرائی
تو پتھر ہی نہیں، موتی بھی ہوتے ہیں یہاں پیدا
وہ شورش ناروا ہے جو تھکا دے ذہنِ انساں کو
وہ بیداری غلط ہے جو کرے خوابِ گراں پیدا
مسیحائی مرے ملکِ سخن کی کوئی کیا جانے
یہ ہے وہ سرزمیں، نابید ہوتے ہیں جہاں پیدا
یہ ہے سیماب منشا انقلابِ دَورِ حاضر کا
کہ ہو ہندوستاں سے اک نیا ہندوستاں پیدا

○
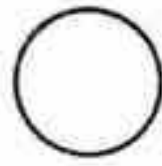
دورِ دوام، عالمِ شام و سحر میں ہے
فطرت بھی میرے ساتھ مسلسل سفر میں ہے
جو نامراد ہے، وہی اس کی نظر میں ہے
لے وائے وہ دعا، جو تلاشِ اثر میں ہے
طاقت ہے پاؤں میں، نہ سکت بال و پر میں ہے
اور کاروانِ شوق ابھی رہگزر میں ہے
تاب و تپش نگاہِ محبت اثر میں ہے
ہے درد سب کے دل میں، ہماری نظر میں ہے
بجھنے کا ڈر نہیں ہے شرارِ حیات کو
جب تک اک اشکِ گرم مری چشمِ تر میں ہے
ویرانیاں نہ پوچھیے حال و خیال کی
صحرا میں ہے جو بات وہی میرے گھر میں ہے
فی الجملہ وہ ہزار بہاروں میں بھی نہیں
جو بات ایک عشوۂ دیوانہ گر میں ہے
نظارے کو نظر سے ہے اک ربطِ معنوی
پھر کیوں حجاب، جلوہ و جلوہ نگر میں ہے
ہے یہ غرض کہ ذہن کو گونہ سکوں ملے
انساں کی بے خودی بھی خودی کے اثر میں ہے

قطعہ

واماندہ خار و خس، شجر و سنگ پابہ گل
پھیلا ہوا جمود مری رہگذر میں ہے
ان کو بھی گرمِ سیر کرے میرے ساتھ ساتھ
یہ حوصلہ بھی آج کسی راہبر میں ہے

ہے ماورائے چشمِ تماشا مقامِ حُسن
وہ تو کچھ اور ہے جو حدودِ نظر میں ہے

ہر سو رواں دواں ہیں خیالوں کے قافلے
میں اپنے گھر میں ہوں، مری دنیا سفر میں ہے

نیت ہی پر ہے تکملۂ ذوق کا مدار
منزل پہ وہ بھی ہے جو ابھی رہگذر میں ہے

کیف و فسون و سحر و کشش، قہر و التفات
ہو ظرف اگر نظر میں تو سب کچھ نظر میں ہے

کر قدرِ عالمِ گذرانِ شباب کی
دل جب ایک رات یہی عمر بھر میں ہے

دنیا قدم قدم پہ مجھے روکتی رہی
گو دیکھتی رہی کہ مُسافر سفر میں ہے

اپنا وقار دیکھ چکا ہوں ازل کے دن
اب تک وہی غرورِ مزاجِ نظر میں ہے

زندہ ہے میرے دم ہی سے ہر شعبۂ حیات
پھیلاؤ میری زندگیٔ مختصر میں ہے

سیماب منتشر ہوئی بزمِ جمالِ دوست
اور دل ہنوز فکرِ نشاطِ نظر میں ہے

○
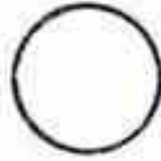
عشق سے تجدیدِ آئینِ بقا کرتا ہوں میں
زندگی سے زندگی کی ابتدا کرتا ہوں میں

جب جنوں کی دعوتِ ہوش آزما کرتا ہوں میں
یہ نہ پوچھو انتظامِ عقل کیا کرتا ہوں میں

اُن کے سننے پر یقیں کر کے دُعا کرتا ہوں میں
دونوں عالم کی وہ سنتے ہیں سُنا کرتا ہوں میں

اپنی صورت سے اُسے جلوہ نُما کرتا ہوں میں
عکسِ آئینہ سے پیدا آئینا کرتا ہوں میں

ہوں وفا کردار، پیمانِ وفا کرتا ہوں میں
انتہا کی آپ جانیں، ابتدا کرتا ہوں میں

جانتا ہوں رہنمائی ایک رسمی قید ہے
باوجودِ علم فکرِ رہنما کرتا ہوں میں

صرف اپنے دل پہ قابو یاب ہو سکتا نہیں
اور سب کچھ حسبِ منشائے وفا کرتا ہوں میں

تنگنائے شوق کا احساس ہوتا ہے مجھے
جب کبھی اک نازِ حُسن آزما کرتا ہوں میں

حشر پیدا ئی نوا و رنگ سے کرتے ہیں وہ
انتظامِ محشرِ رنگ و نوا کرتا ہوں میں
اُس کے دل میں جذب کر کے اپنے دل کی دھڑکنیں
حُسن کو احساس کے جذبے عطا کرتا ہوں میں
جبہ سائی سے نہ بدلے زاویے تقدیر کے
دیکھیے اب دوسری تدبیر کیا کرتا ہوں میں
جانتے ہیں سیل و ساحل دیر تدبیری مری
بیٹھ کر کشتی میں فکرِ ناخُدا کرتا ہوں میں
التجا یہ ہے کہ واپس التجائیں کر مری
مدعا یہ ہے کہ ترکِ مدعا کرتا ہوں میں
رحم کے قابل نظر آتی ہے دُنیا حُسن کی
جب کبھی ترکِ وفا کا حوصلا کرتا ہوں میں
ذرّے ذرّے میں ہے امکاں آستانِ دوست کا
اس یقیں کے ساتھ سجدے جابجا کرتا ہوں میں
اِس کو اے سیماب پہنچاؤں گا تا حدِ عروج
قوم کے اقبال سے عہدِ وفا کرتا ہوں میں
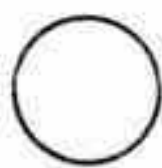
یہ سوچتے تھے کہ اُن سے ویرانیٔ جہاں کا گلا کریں گے
مگر سُنا یہ کہ وہ خزاں سے بہار کی ابتدا کریں گے

کڑی نہ جھیلی تو نظم کیوں کر جہانِ آزاد کا کریں گے؟
قفس کی تخریب کرنے والے، چمن کی تعمیر کیا کریں گے!

نہ بھول صیّاد و باغباں پر، کہ بندوبستِ فضا کریں گے
یہ اپنے نام و نُمو کے بدلے، چمن کی نشو و نما کریں گے؟!

یہی تصوّر کے کھیل کب تک، گمان بدلے نہ کیوں یقیں سے؛
جو آج تک ذہن آشنا ہے، اُسے نظر آشنا کریں گے

ہیں جمع اہلِ عمل قفس میں، جنوں ہمیں لے بھی چل قفس میں
بہار ہے آج کل قفس میں، چمن میں ہم رہ کے کیا کریں گے

یقین اور وہم کے سہارے، اُٹھا کے رکھ دیں گے اہلِ عالم
جب اپنی پوشیدہ قوتوں کا یہ ایک دن تجربا کریں گے

خیال یہ ہے کہ ترک کر دیں، تصوّر اُن کا تخیّل اُن کا
خیال سے جب وہ ماورا ہیں، خیال بھی کر کے کیا کریں گے

روایتی نارسائیاں ہیں نصیب واماندگانِ منزل
کبھی جو نالہ بھی یہ کریں گے تو نالۂ نارسا کریں گے

نئے نئے دعوتِ نظر کے محاذ ہونے لگے ہیں قائم
وہ شاید اپنی تجلّیوں کا، نیا کوئی تجربا کریں گے
غلط، کہ میرے ہی منتظر ہیں، نگاہ دارانِ غنچہ و گل
چمن میں آزاد رہنے والے، اسیر کا آسرا کریں گے!؟
کوئی تو ہے بات ماسوا میں، دل و نظر جس سے رک گئے ہیں
دل و نظر سے بلند ہو کر، تجسّسِ ما سوا کریں گے
حیات اور موت کے معمّے، نہ ہوں گے حل ذہنِ آدمی سے
وہ ہیں بقا و فنا کے مالک، وہی کوئی فیصلا کریں گے
سفر ہے بے خواہش و ارادہ، نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ
جہاں سے پہنچے ہیں انتہا پر، وہیں سے پھر ابتدا کریں گے
دُعا ہے فرضِ نیاز مندی، تو اس میں آمیزشِ غرض کیوں
دُعا تو ان سے کریں گے لیکن، دُعائے بے مدّعا کریں گے
ٹپک پڑے آنکھ سے جو آنسو، وہ پھر فروغِ نظر نہ ہوں گے
یوں ہی چمکتے رہیں گے جگنو، یوں ہی ستارے کِھلا کریں گے
جمال میں جتنی بجلیاں تھیں وہ ہو چکیں صرف طور و دل پر
اب اُن کے پاس اور کیا رہا ہے جسے وہ جلوہ نما کریں گے
نثار کر دیں گے اِس پہ سیماب، توتیِ غیرت و وفا کی
وطن سے جو عہد کر چکے ہیں، وہ عہد اک دن وفا کریں گے
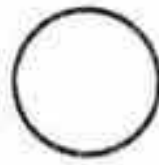
سوئے زنداں، انقلاب تیز گام آہی گیا
گوشہ گیرانِ قفس، وقتِ خرام آہی گیا
ناصیہ سائی کا وقتِ اختتام آہی گیا
دل جہاں کرتا ہے سجدے وہ مقام آہی گیا
عشق پر الزامِ ضبطِ ناتمام آہی گیا
باوجودِ سعی لب پر ان کا نام آہی گیا
دفعتاً مرگِ محبت کا پیام آہی گیا
تھا جو لمحہ حاصلِ عمرِ دوام آہی گیا
فدیۂ راہِ وفا ہوجائے ہر جزوِ حیات
جان بھی کام آئے یارب، دل تو کام آہی گیا
غیر حاضر کب ہوئے محفل سے میری مہرو ماہ
کوئی بعدِ صبح کوئی بعدِ شام آہی گیا
چلتے چلتے شورشِ ہستی کی حد آہی گئی
آتے آتے مرکزِ امن و سلام آہی گیا
کیا ٹھکانہ تھا ہمارا باغ میں بعدِ بہار
وہ تو کچھ تقدیر سے رستے میں دام آہی گیا

آخر آخر مٹ گیا وہ ملتوں کا اختلاف
سب جہاں ملتے ہیں رستے وہ مقام آ ہی گیا
تھی کمندِ فکر میری، فرش پیما، عرش گیر
طائرِ سدرہ بھی میرے زیرِ دام آ ہی گیا
لالہ و گُل کی ہَوا خواہی نے باندھی وہ ہَوا
میرے ہاتھوں میں چمن کا انتظام آ ہی گیا
ہوش سرِ راہِ طلب میں ہے نہ اب ہوشِ قدم
جس کا اندیشہ تھا مجھ کو وہ مقام آ ہی گیا
نذر کی اُن کو متاعِ ضبط، وقتِ واپسیں
میں نے جو آنسو بچایا تھا وہ کام آ ہی گیا
ہوتے ہوتے ہو گیا سِرِّ نہانِ عشق عام
آتے آتے تا لب و گوشِ عوام آ ہی گیا
بے قراری سے کہے دیتا ہوں رکھّے احتیاط
خیر اب تو میرے لب پر اُن کا نام آ ہی گیا
کیا عجب تا عرش بھی پہنچے کوئی جلوہ طلب
طور تک تو ایک مشتاقِ کلام آ ہی گیا
ہو گیا سیماب باطل زعمِ ترکِ مے کشی
لفظ بن کر آج میرے لب پہ جام آ ہی گیا

○
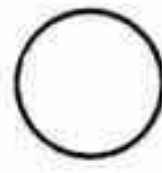
نہ مجھے شگفتِ خیال دی، نہ خیالِ عقدہ کشا دیا
کوئی زندگی ہے یہ زندگی، جسے اک طلسم بنا دیا

بخیالِ جلوہ نمائی جب، قدم اُس نے اپنا بڑھا دیا
تو وہ رہگذار تھی کون سی، جسے آئینہ نہ بنا دیا

نہ دو مجھ کو طعنۂ خود سری، میں خودی کے عیب سے ہوں بَری
یہ خودی تھی یا تھی خدا گری کہ خدا بُتوں کو بنا دیا

ہے یہی تو مقصدِ زیر و بم کہ رہے توازنِ کیف و کم
تجھے لحنِ نغمہ فروش دی، مجھے قلبِ نالہ سرا دیا

مرا دل جو محوِ نیاز ہے تو نہ مصلحت ہے نہ راز ہے
یہی بندگی کا جواز ہے کہ خدا نے بندہ بنا دیا

دل و جان و صبر و قرار و دیں، کیے نذرِ جلوۂ بُتکدہ
مگر اتنی بات ضرور ہے، جو دیا بنامِ خدا دیا

مرے عشق میں وہ غرور تھا کہ حریفِ عظمتِ طور تھا
کوئی اِس میں بھید ضرور تھا کہ سر اُن کے در پہ جھکا دیا

تھی حدودِ دل ہی میں آج تک خلشِ الم تپ و تابِ غم
یہ مجھی پہ عشق کا ہے کرم، کہ تمام درد بنا دیا

میں حضورِ حُسن پہنچ گیا، مجھے نذر کا بھی صلہ ملا
مگر اب کسی کو بتاؤں کیا، جو لیا لیا، جو دیا دیا

دلِ داغدار سے چھیڑ سی، رہی یاس اور اُمید کی
کبھی اک چراغ جلا دیا، کبھی اک چراغ بجُھا دیا

یہ حریم لالہ و بزمِ گُل، ہیں وفا و حُسن کے زاویے
کہیں مَیں نے پاؤں جما دیے، کہیں اُس نے رنگ جما دیا

تھی جو بات خاصۂ زندگی، مجھے یاد زندگی بھر رہی
مگر ایک ایسی بھی یاد تھی جسے مصلحت نے بھُلا دیا

دیا تخت و تاج و عَلَم مجھے، نظر و کتاب و قلم مجھے
نہ دیا جو اپنا ہی غم مجھے، تو پھر اتنا دے کے بھی کیا دیا

اُسے شورِ بزمِ نشاط میں، کوئی سُن سکا کہ نہ سُن سکا؟
وہی ایک نوحۂ بے صدا، جو مری نظر نے سُنا دیا

ہمراہِ وقت، یہ شوخیاں تو نگاہِ حُسن کی دیکھیے
کہ حجاب اٹھاتے اٹھاتے رسمِ حجاب کو بھی اُٹھا دیا

چلی انقلاب کی وہ ہوا، کہ سبھی چراغ بجھا دیے
نہ فقط چراغ بجُھا دیے، دلِ انجمن بھی بجُھا دیا

نفسِ فسردہ کو واں ترستی، ہے تلاشِ برق و شرار کی
مری آہِ سرد کو کیا دیا جو مزاجِ موج و ہوا دیا

۱۹۳۵ء

ابھی موجود ہیں آثارِ آزادی زمانے میں
وہ طائر ہیں قفس میں جو نہیں ہیں آشیانے میں
ہزاروں ایسی تصویریں ہیں اس تصویر خانے میں
ہوئی ہے صَرف میری شعریت جن کے بنانے میں
یونہی اہلِ چمن کی عمر گزری آنے جانے میں
قفس میں آشیانے سے، قفس سے آشیانے میں
وہ میں ہوں صلح کی جس نے بنا ڈالی زمانے میں
کیا اک ربط قائم مسجد اور ناقوس خانے میں
میں ہوں اک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دُہراتی رہے گی ہر زمانے میں
یہ حیرت گاہِ کثرت عکس ہے اک ذاتِ واحد کا
ہے تصویر ایک ہی پھیلی ہوئی آئینہ خانے میں
جو کیفِ جاودانی ہے مسلسل یاد میں اُس کی
وہ کیفیت نہیں ہے یاد کر کے بھول جانے میں
جو دیتے ہیں سبق محتاط رہنے کا نگاہوں کو
وہ کانٹے سر برآوردہ ہیں پھولوں کے گھرانے میں

مجھے افسوس ہے دنیا کی اس افسانہ سازی پر
کہ اپنی بھی کہانی چھیڑ دی میرے فسانے میں
عقیدت کچھ بنا دے، ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا میکدے کے آستانے میں
ہمیں بھی جلوہ گاہِ طور پر اک دن بلا دیکھو
بہت بے باک ہو تاب نظر کے آزمانے میں
اب اِس دنیا سے ہے تعمیر کی اُمید لاحاصل
یہ دنیا آج خود مصروف ہے اپنے مٹانے میں
مقدّر آزمائی چھوڑ، شاکر ہو مقدّر پر
کہ پہلوئے بغاوت ہے مقدّر آزمانے میں
یہ کُہر آلود صبحیں اور یہ بھیگی ہوئی راتیں
بہار آزاد ہے، میں ہوں مقید آشیانے میں
بھرے گی ان کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں
جُھکا اِس وقت، جب مجبورِ سجدہ خود ہو سر تیرا
ہے بے حد فرق بابا سر کے جُھکنے اور جُھکانے میں
مجھے کیوں انقلابِ حال پر سیماب حیرت ہو
کہ ایسے انقلاب آتے رہے ہیں ہر زمانے میں

جو ہے زندانِ غم دنیا تو فکرِ این و آں کیوں ہے
قفس رہنے کے قابل کیوں نہیں ہے آشیاں کیوں ہے
متاعِ عشق بازارِ ہوس میں رائیگاں کیوں ہے؟
یہ سودا تو دلوں میں چاہیے ہونا' یہاں کیوں ہے؟
محبت راز ہے تو' عشق اُس کا ترجماں کیوں ہے
یہ کس سے پوچھیے خاموش ہونٹوں پر فغاں کیوں ہے
خلل انداز میرے نغمۂ غم میں جہاں کیوں ہے
جو وقتِ عرض نالہ ہے' وہی وقتِ اذاں کیوں ہے
اگر دنیا نہیں ہے زندگی کا معنوی مدفن
تو پھر انسان پر طاری یہاں خوابِ گراں کیوں ہے
مسلسل انقلابِ رنگ و بو ہے قسمتِ گلشن
چمن والوں کو خوفِ انقلابِ گلستاں کیوں ہے
گراں اس پر نہیں ہے بار جب حُسنِ مجسم کا
تو پائے ناز پر ہلکا سا اک سجدہ گراں کیوں ہے؟
نگاہِ عشق سے کیا ہوگئی تھی ایسی گستاخی؟
وہ جلوہ اس قدر گہرے حجابوں میں نہاں کیوں ہے؟

نہیں ہے علم جس کو انقلابِ دورِ عالم کا
وہ کیا جانے بہار اس باغ میں کیوں تھی؟ خزاں کیوں ہے؟
حدیثِ عشق کی اِس رنگ میں توہین ہوتی ہے
ہمارا ذکر اُن سے برسبیلِ داستاں کیوں ہے؟
ہر اک پتھر کے دل میں نور پنہاں ہے حقیقت کا
تو پھر دیر و حرم کا آستاں ہی آستاں کیوں ہے؟
نہ میں موسیٰ، نہ کوہِ طور ایوانِ بلند اُن کا
خدا جانے مرے ذوقِ نظر کا امتحاں کیوں ہے؟
کہاں کنجِ قفس میں وہ چمن کی پُر سکوں نیندیں
پریشاں اب مری آنکھوں میں خوابِ آشیاں کیوں ہے؟
کوئی آشفتۂ منزل ملے تو اس سے پوچھوں میں
قیامت آج برپا کارواں در کارواں کیوں ہے؟
نہ بنتا کارواں تو کم سے کم منزل ہی بن جاتا
غبارِ کارواں اب تک غبارِ کارواں کیوں ہے؟
ہے زیرِ بحث اب یہ مسئلہ سیماب دنیا میں
غلامِ دَورِ کہنہ شاعرِ ہندوستاں کیوں ہے؟

○
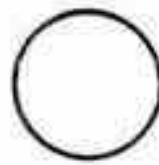
سدرہ نے دی ہے دعوتِ صد آشیاں مجھے
اب دیکھنا ہے حوصلۂ آسماں مجھے
رنجِ قفس ہے اب، نہ غمِ آشیاں مجھے
لے آئی بے نیازیٔ فطرت کہاں مجھے؟!
خلدِ بریں کے بعد، دیا خاک داں مجھے
انساں بنا کے، خوار کیا ہے کہاں مجھے
کیا جانے عقل و عشق میں کیسی کب سے سازشیں
جب راز کھُل چکا تو مِلا راز داں مجھے
اُچٹی ہوئی سی نیند کا خوگر ہوں اے فلک
سُن لے کہ نا پسند ہے خوابِ گراں مجھے
ہر کارواں کے سامنے، تھے چند راستے
ہر راستے میں چند ملے کارواں مجھے
رگ رگ ہے گلستاں کی، نگاہِ خیال میں
دے گا فریب کیا کوئی دامِ نہاں مجھے
رسوا ہے چشمِ اہلِ خرد میں مرا مذاق
دیکھو ذرا یہ دیکھ رہے ہیں کہاں مجھے؟

برق آزمودۂ چمنِ روزگار ہوں
ہے نخلِ طور پر ہوسِ آشیاں مجھے

بعدِ دعا، یہ حُسنِ عقیدت، یہ اعتبار
جیسے کسی نے بخش دیے دو جہاں مجھے

مٹنا نہیں ہے، بے کسی و بے دلی کے ساتھ
بننا نہیں ہے گردِ رہِ کارواں مجھے

تاریخِ انقلابِ چمن لکھ رہا ہوں میں
ہے لوٹنا ہر اک ورقِ گلستاں مجھے

سجدوں کے اور لاکھ ٹھکانے ہیں، سربخیر!
کچھ عرش تو نہیں ہے ترا آستاں مجھے

اللہ رے یہ ظرفِ مشیّت کی وسعتیں
اِک مُشتِ خاک بھی نہ ملی جاوداں مجھے

سیماب میرے شعر ہیں جُرعاتِ آگہی
حاصل ہے فیضِ مجلسِ روحانیاں مجھے

○
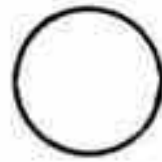
جو در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ خو ہوتی
میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی
مسلسل کیوں فضائے طور سرمہ در گلو ہوتی
نہ تھے موسیٰ تو ہم سے ہی کسی کی گفتگو ہوتی
محبت کاش اتنی کامیاب و سرخرو ہوتی
مرے دل کی تمنا اُن کے دل کی آرزو ہوتی
بھرے جاتے نہ شبنم کے کٹورے آب شبنم سے
سرِ گلشن اگر جائز نمازِ بے وضو ہوتی
متاعِ ضبط وقتِ واپسیں کی رائیگاں میں نے
نگاہِ حُسن میں ایک اشک کی کیا آبرو ہوتی
مُسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جُستجو ہوتی
حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں!
ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھُل کر گفتگو ہوتی
بالآخر پھر بھرا کر اپنے ہی دَر پر پھر آ بیٹھے
کہاں تک جستجو کرتے کہاں تک جستجو ہوتی

دلِ بے آرزو کو دل سمجھنا ہی حماقت ہے
کہ دل ہوتا تو اُس میں لامحالا آرزو ہوتی
کبھی تو وہ اجازت مجھ کو عرضِ حال کی دیتے
کبھی تو ختم میری داستانِ آرزو ہوتی
غلط ہے عشق پر الزام آوارہ نگاہی کا
جو ہوتا حُسن یکسو، تو نظر کیوں چار سو ہوتی
دل اک قطرہ تھا، ژولیدہ، چکیدہ، سیلِ غم دیدہ
ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی!
میں برقِ حُسن کو روکے ہوئے ہوں دل پہ لے دنیا
اگر یہ کوند کر گرتی تو میں ہوتا نہ تو ہوتی
وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ
جزائے آرزو یارب، بقدرِ آرزو ہوتی
دل اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا
نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی
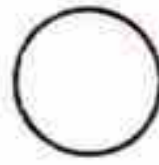
میں یوں راہِ ہستی میں گرمِ سفر ہوں
نظر بر قدم ہوں، قدم بر نظر ہوں
میں پابستۂ دورِ شام و سحر ہوں
تو پھر کیا بتاؤں، کہاں ہوں کدھر ہوں؟
نظر اس کی نیچی، میں بالا نظر ہوں
وہ جلوہ نما ہے، میں جلوہ نگر ہوں
بلندی و پستی مری کچھ نہ پوچھو
کبھی عرش پر ہوں، کبھی طور پر ہوں
پُر از جلوہ ہے صورتِ آئینہ دل
خدا جانے میں کس کے پیشِ نظر ہوں
یہ ہے جبرِ فطرت، کہ دارِ فنا میں
ضروری نہیں میرا ہونا، مگر ہوں
بہاریں چمن میں، ہیں آزاد مطلق
میں زنداں میں ہوں اور بے بال و پر ہوں
یہ میرے تصور کی گہرائیاں ہیں
کہ چھایا ہوا تیرے احساس پر ہوں

مآلِ جہاں پر کروں تبصرہ کیا
میں انجام سے اپنے خود بے خبر ہوں
ہوائیں حوادث کی، گھیرے ہوئے ہیں
بجھا سا چراغِ سرِ رہگذر ہوں
نہیں ہوں تو ہونے کا احساس کیوں ہے؟
مری غایتِ بود کیا ہے؟ اگر ہوں
نہیں کچھ ہوس ماسوائے تماشا
کہ میں تو سراپا نظر ہی نظر ہوں
مجھے اپنے رستے پہ منزل لگا لے
مسافر ہوں، نو واردِ رہگذر ہوں
نہیں کم لحد میں عذابِ محبت
یہاں بھی اسیرِ شبِ بے سحر ہوں
جبیں اُن کے در سے نہ سیماب اٹھے
کہ میں سر بسجدہ ہوں، سجدہ بسر ہوں
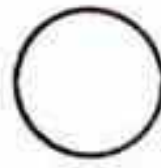
یہ کس مقام پہ لایا مذاقِ تشنہ لبی
جہاں کمالِ ادب ہے، کمالِ بے ادبی
مجھے یقیں ہے کہ آئے گا اب نہ کوئی نبی
مگر جہاں میں ہے باقی ہنوز بولہبی
مجھے تو راس نہ آیا فشردۂ عنبی
نہ سوزِ روح ہوا کم، نہ دل کی آگ دبی
نہیں کسی کے لبوں میں بھی جنبشِ احساس
اگرچہ سب کی نظر میں ہے میری خشک لبی
میں کیا بتاؤں تجھے چارہ ساز وجہِ خلش
بڑا سبب ہے یہی دردِ دل کی بے سببی
بلند و پاک فضاؤں میں رقصِ ابرِ سیاہ
کہ جیسے زلف بدوش اک دوشیزۂ عربی
میں اپنے دل کے لیے اُس سے چین کیا مانگوں
اُسے پسند نہیں ہے مری سکوں طلبی
طریقِ عشق و وفا میں عبادتیں دو ہیں
بس ایک صبح کا نالہ اور ایک آہِ شبی
مرے کفیل ہیں دونوں جہاں میں اے سیماب
رسولِ ابطحی و ہاشمی و مطلبی

○
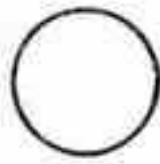
کعبہ میں تنگ ہیں، دلِ دیر آشنا سے ہم
اس کا گلہ بتوں سے کریں یا خدا سے ہم
حقدارِ سلسبیل نہ کیوں ہوں خدا سے ہم
ہیں میکدے گواہ، کہ آئے ہیں پیا سے ہم
یوں اپنی بارگاہ سے ہم کو نہ ٹالیے
دل چھپیاں نہ لینے لگیں ماسوا سے ہم
اے کاشش، کوئی نغمہ منزل بھی چھیڑ دے
گھبرا گئے ہیں شورشِ بانگ درا سے ہم
دل میں خدا کا دھیان، نظر میں خودی کی شان
بندے بنے بتوں کے، مگر کس ادا سے ہم!
کہہ دو ٹھہر کے آئے ابھی شورِ انقلاب
اک گیت سُن رہے ہیں چمن کی ہوا سے ہم
دانستہ کھا رہے ہیں فریبِ وفائے دوست
مجبور ہیں جفائے محبت نما سے ہم

کیف و اثر ہے مختلف، آواز و ساز کا
ہے مست اپنے چنگ سے مطرب، نوا سے ہم
انکار دوجہاں سے مسلّم ہوا ـــــ مگر
فارغ ابھی نہیں ہوئے تفسیرِ "لا" سے ہم
ہر گوشۂ نظر میں ہے اک محشرِ خیال
گھبرا گئے ہیں، اپنی نگاہِ رسا سے ہم
دنیائے حُسن میں ہے ہماری وفا کی دھوم
حالانکہ مطمئن نہیں اپنی وفا سے ہم
نظّارہ ہے محال، تو حیرانیاں سہی
کچھ لے کے جائیں گے تری جلوہ سرا سے ہم
گزُری تمام عمرِ وفا انتظار میں
ہارے ترے تغافلِ دیر آشنا سے ہم
یہ روگ تو ہے سجدوں کی، سجدہ نہیں سہی
بیٹھے ہیں سر لگائے ترے نقشِ پا سے ہم
اب تک نہ حدِّ منزلِ عشق و وفا ملی
گو انتہا کی کھوج میں ہیں ابتدا سے ہم
آئے تو تھے بہائے وفا کی اُمّید میں
لُٹ کر چلے ہیں حُسن کی دولت سرا سے ہم
یہ کیا مذاق ہے کہ تماشائی ہو جہاں
جنگ آزما ہوں جلوۂ تاب آزما سے ہم

اتنا بھی دخلِ غیر گوارا نہیں ہمیں
سجدے بدل رہے ہیں ترے نقشِ پا سے ہم
سیماب مرگ و زیست کا نکلا نہ کچھ مآل
نکلے نہ قید خانۂ ارض و سما سے ہم
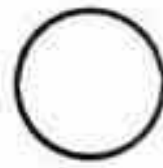
ٹوٹی آس اُن کے آنے کی، بیکل ہوں آرام نہیں
یا جھپکی جاتی تھیں آنکھیں، یا اب نیند کا نام نہیں
منزل تیری دور مسافر، رکنے کا ہنگام نہیں
جلد پہنچ جانے کا رستہ، چلنا ہے آرام نہیں
وہ سب کے جانے پہچانے، ذوق مرا بدنام نہیں
حُسن کے جلوے عام ہیں یعنی عشق کے جلوے عام نہیں
یاس بھرے نالوں سے تھک کر آس بھرے کچھ گیت ہی گا
عشق کی کار آمد دنیا میں، بیکاروں کا کام نہیں
پھولوں سے اب رسم نہیں ہے، راہ نہیں ہے تاروں تک
صبح ہماری صبح نہیں ہے، شام ہماری شام نہیں
پامردی سے کام لیے جا منزل خود مل جائے گی
ایسا بھی آغاز ہے کوئی، جس کا سرانجام نہیں
آج خزاں میں آزادی سے بیٹھے، آنسو پیتے ہیں
اس موسم کے کیا کہنے ہیں، دانہ ہے اور دام نہیں
کان کو چھونے والی باتیں، کچھ نہیں خالی باتیں ہیں
جو دل کو بیدار نہ کردے وہ دل کا پیغام نہیں

اے بندے جذبات و ہوس کے، نفس کی اپنے خیر منا
عشق کی لذّت تو کیا جانے، عشق ترا ناکام نہیں
مرنے والے، موت تو اک تمہیدِ دورِ ثانی ہے
انجام آغاز ہے لیکن انجام انجام نہیں
حُسن پرستی کے جذبوں کو ناموں سے منسوب نہ کر
حُسن ہے اک بے نام حقیقت، حُسن کا کوئی نام نہیں
دل خلوت گیر سینہ ہے، حسن ہے چلمن آسودہ
پھر میں کیوں ہوں صحرا صحرا، مجھ کو کیوں آرام نہیں
پیار کریں اور رنج اٹھائیں، دل دیں اور رہ جائیں
قسمت کے سب کھیل ہیں پھر بھی قسمت پر الزام نہیں
منزل کا ہے شوق تو اپنے پاؤں بڑھا، ہاں پاؤں بڑھا
منزل منزل رٹنے والے، منزل زیرِ گام نہیں
ہائے یہ مجبوری کا عالم، آہ یہ پاسِ ضبطِ وفا
دل میں اس کی یاد ہے ہر دم، لب پر اس کا نام نہیں
شوخی میں بھی اک پہلو ہے مجبوری کا اے سیماب
عشق ہی بے آرام نہیں ہے، حُسن کو بھی آرام نہیں

سنہ ۱۹۴۶ء

○

فسردگی یاس کی ہے دل میں، شکستگی کا خیال بھی ہے
یہ آئینہ ماند ہی نہیں ہے، اس آئینہ میں تو بال بھی ہے
ہے سہل اس کا وصال لیکن، یہ حال ہے تو محال بھی ہے
مجھے تو ہے فکرِ ماسوا بھی، تجھے تو اپنا خیال بھی ہے
عروجِ عالم ابھی ہے مشکل، عروجِ عالم محال بھی ہے
ابھی تو دنیا میں آدمیّت ذلیل بھی پائمال بھی ہے
نشاطِ منزل میں کھونے والو، تمھیں کچھ اس کا خیال بھی ہے
تمھاری اس رہگذار میں اک مسافرِ پائمال بھی ہے
ہے تیرا ہی آئینہ یہ انساں، تو کیوں اِسی میں تجھے نہ دیکھوں؟
اِسی میں تیرا جمال بھی ہے، اِسی میں تیرا جلال بھی ہے
وہی تباہی ہے یا الٰہی، وہی ہے جینا وہی ہے مرنا
ہے داستانِ طویل دنیا، مگر کچھ اس کا مآل بھی ہے
تمھاری محفل میں باریابی، ہے قابلِ شکر کامیابی
اگر نہ ہو ناگوارِ خاطر تو حسرتِ عرضِ حال بھی ہے
فقیر مجھ کو سمجھ کے، خاموش بیٹھے، کیا منہ کو تک رہے ہو؟
زبان دی ہے تو یہ بھی پوچھو، کہ تیرا کوئی سوال بھی ہے

خموش و سرگشتۂ تحیّر، نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے
جو تیری تصویر کی ہے صورت، وہی تصوّر کا حال بھی ہے
وہ اک جمالِ لطیف و تنہا، اور اُس پہ ہنگامۂ تماشا!
خیال سب کو ہے اپنا اپنا، کسی کو اُس کا خیال بھی ہے؟
وہ دل میں پیوستہ جلوہ گر ہو، تو روح بھی اُس سے بہرہ ور ہو
یہی تقرّب کا ہے خلاصہ، یہی مُرادِ وصال بھی ہے
خزاں ہے دیباچۂ بہاراں، ہے آخرِ شب سحر کا عنواں
زوال سے تو ہے کیوں پریشاں، زوال ہی میں کمال بھی ہے
ملال سے بھی تو اپنے خوش ہو، اگر سمجھ لے یہ بات میری
خوشی میں جو تھا شریک تیری، وہی شریکِ ملال بھی ہے
ہے سبزہ پژمردہ، میں ہوں آزردہ، آشیاں ہے شرار خوردہ
کلی فسردہ ہے، پھول مُردہ، چمن میں کوئی نہال بھی ہے؟
یہ نہرِ تسنیم و حوضِ کوثر، یہ صاف چشمے، یہ پاک ساغر
یہیں کہیں خستہ و شکستہ ہمارا جامِ سفال بھی ہے؟
میں طورِ موسیٰ کے دور ہی سے جلال کا آپ کے ہوں قائل
یہ صرف ہے پاسِ پردہ داری کہ اعترافِ جمال بھی ہے
میں اہلِ کردار بھی ہوں سیماب، مردِ گفتار ہی نہیں ہوں
یہ خاصّہ ہے مری غزل کا کہ حال بھی اور قال بھی ہے
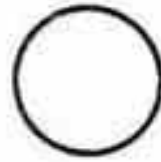
وفا سے کھیل لینے دو، جفا سے کھیل لینے دو
محبت کو نشاطِ ابتدا سے کھیل لینے دو
فضا سے کھیل لینے دو، ہوا سے کھیل لینے دو
مجھے بازیچۂ ارض و سما سے کھیل لینے دو
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں لوگ کہتے ہیں
جو یہ سچ ہے تو مجھ کو ماسوا سے کھیل لینے دو
مآلِ یورشِ ابر و ہوا معلوم ہے مجھ کو
نشیمن کو مرے ابر و ہوا سے کھیل لینے دو
وہ کوئی اور ہے جو مجھ کو طوفاں سے بچائے گا
خرد کو اعتبارِ ناخدا سے کھیل لینے دو
مری ترکیب میں جہل و خطا کی جزو بندی ہے
میں انساں ہوں مجھے جہل و خطا سے کھیل لینے دو
سرِ سودا زدہ مقبولِ پائے دوست بھی ہوگا
ابھی نقشِ جبیں کو نقشِ پا سے کھیل لینے دو
ہمیں معلوم ہے تم طور پر کھیلے تھے موسیٰ سے
ہمیں بھی جلوۂ تاب آزما سے کھیل لینے دو

جو ہیں منزل رسیدہ اُن سے تعلیمِ رسائی لو
جو راہی ہیں انھیں بانگِ درا سے کھیل لینے دو
بس اب اُٹھنے ہی کو ہے غلغلۂ صورِ قیامت کا
مغنّی کو ذرا سازو نوا سے کھیل لینے دو
جلالِ کبریا سیماب چھانے کو ہے دُنیا پر
کوئی دن اور بندوں کو خدا سے کھیل لینے دو
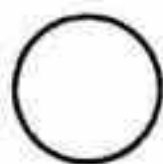
میں آرزو زدۂ عیشِ مستعار نہیں
خزاں ہے میری مرادِ نظر، بہار نہیں
شگفتگی دلِ ویراں کو سازگار نہیں
یہاں بہار کے موسم میں بھی بہار نہیں
یہ سرخ پھول، بجز خونِ لالہ زار نہیں
اسے بہار کا دھوکا ہے یہ بہار نہیں
اک ایسے عالمِ وارفتگی میں ہوں کہ جہاں
کسی کا اپنے سوا مجھ کو انتظار نہیں
پرائے دل پہ تو ہے ضبطِ اختیار اسے
اور اپنے دل پہ خود انساں کو اختیار نہیں
وہ قطرہ ہوں جو نہیں باریابِ دامنِ موج
وہ موج ہوں جو کنارے سے ہمکنار نہیں
کسی سے دعویٰ نفرت کرے گا کیا انساں
ابھی تو اُس کو محبت بھی سازگار نہیں
اُجڑنے پر بھی مری شانِ وضعداری دیکھ
کہ دل میں خاک بھری ہے مگر غُبار نہیں

مری نوا میں تو اب بھی ہے قوّتِ پرواز
مگر ہوا ہی زمانے کی سازگار نہیں
حیاتِ تازہ کا ہے مرگِ عشق اک پیغام
خدا کا شکر کہ منزل مری مزار نہیں
مری نگاہ میں ہے ایک زندہ مستقبل
میں اپنے ماضیٔ مُردہ کا سوگوار نہیں
چمن کو گرم کرے کیا تری تنک تابی
کہ زندگی تری شبنم تو ہے شرار نہیں
مری رسائیٔ منزل سے ناامید نہ ہو
خبر تو ہے تجھے، میں نقشِ رہگذار نہیں
ترے تبسّمِ رنگیں کی خیرات سے نہ کھیل
یہ دل کے داغ ہیں بازیچۂ بہار نہیں
فرشتے کان پہ رکھتے ہیں ہاتھ اے سیماب
کوئی مآلِ محبّت کا ذمّہ دار نہیں
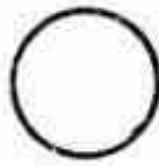
میری رفعت پر جو حیراں ہے تو حیرانی نہیں
تو ابھی انساں کی عظمت کا عرفانی نہیں

اور یہ کیا ہے جو ضبطِ سوزِ پنہانی نہیں
آگ روشن دل میں ہے، چہرے پہ تابانی نہیں

پھول کے پتّے بکھر کر اک فسانہ کہہ گئے
جس کی ہو ترتیب ممکن، وہ پریشانی نہیں

مجھ پر اک الزام ہے قیدِ قفس، وہ بھی غلط!
جس کی نیّت میں ہو آزادی وہ زندانی نہیں

جوشِ گریہ، اُس پر آہوں کی یہ سیلابی ہوا
کون سی ہے موجِ اشک ایسی جو طوفانی نہیں

راز یہ مجھ پر شکستِ غنچہ و گل سے کھُلا
حُسن بھی تو بے نیازِ چاک دامانی نہیں

خواہشوں کے ساتھ اپنے نفس کو بھی کر فنا
زندگی میں اس سے بہتر کوئی قربانی نہیں

التفاتِ محبت نے یہ ثابت کر دیا
وہ بھی پیشانی میں ہے شاید جو پیش آنی نہیں

دولتِ کونین سے بھی ہے گراں تر اک سکوں
دل ہو مستغنی تو پروائے جہاں بانی نہیں
جاودانی ہوں میں لے دنیا پرستش کر مری
یہ مسلّم ہے کہ تو فانی ہے میں فانی نہیں
حوصلوں کے ساتھ طے کر راہِ دشوارِ حیات
حل تو ہوں گی مشکلیں لیکن بہ آسانی نہیں
دیکھ اے ساقی قناعت کی طرب افشانیاں
آبِ کوثر ہے کٹورے میں مرے پانی نہیں
ہے مری نظروں میں انجامِ بہارِ گلستاں
اب مرے سر میں ہوائے گل بدامانی نہیں
بہہ چکا ہے خون پانی کی طرح انسان کا
معتدل پھر بھی مزاجِ عالمِ فانی نہیں
کر نہ اے کنجِ لحد زحمت مرے آرام کی
میں مجاہد ہوں مجھے خوئے تن آسانی نہیں
کر رہا ہوں نظم اے سیماب قرآنِ مجید
اور یہ کیا ہے اگر تائیدِ یزدانی نہیں

○

تھے خود بیں مگر خود نما ہو گئے ہم
ہمیں دیکھیے کیا سے کیا ہو گئے ہم
کبھی خوش کبھی غمزدا ہو گئے ہم
جو کچھ ہم کو ہونا ہوا ہو گئے ہم
ہوئے تو یہاں تک رسا ہو گئے ہم
ندیم حریم وفا ہو گئے ہم
نہ پوچھو کہ اُن کی نظر میں سما کر
خود اپنی نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم
نہ تھے ہم زمانی، نہ باقی نہ فانی
جو کچھ آپ نے کہہ دیا ہو گئے ہم
کہاں ہوگی یہ نازشِ بے وفائی
اگر بے نیازِ وفا ہو گئے ہم
ہماری پرستش بھی تھی کیا پرستش
بتوں نے یہ سمجھا خدا ہو گئے ہم
قسم اب وہ کھانے لگے ہیں ہماری
بڑی چیز نامِ خدا ہو گئے ہم

کرم نے ترے کر دیے کچھ اضافے
جو ہونا تھا اُس سے سوا ہو گئے ہم

تمھیں طور کیا گھر پہ آنا پڑے گا
اگر حوصلہ آزما ہو گئے ہم

محبّت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا
مگر یہ کہ درد آشنا ہو گئے ہم

سنائی نہ جب تم نے آواز اپنی
تو ناموسِ چنگ و نوا ہو گئے ہم

خدا ہونے والوں نے اتنا نہ سوچا
کہ بندے سے کیوں کر خدا ہو گئے ہم

یہ عقدہ محبّت میں کھُلنے نہ پایا
کہ وہ ہو گئے جذب یا ہو گئے ہم

جو نیّت میں تر دامنی ہو تو کافر
گنہگارِ ابر و ہوا ہو گئے ہم

بنی راہِ منزل میں تربت ہماری
مرے بھی تو منزل نما ہو گئے ہم

قطعہ

ہم انسان ہیں پوچھنا کیا ہمارا
کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے ہم

فرشتوں کو شاید ابھی یاد ہوگا
کہ مسجود سر تا بہ پا ہو گئے ہم

بیاباں میں گونجے تو ہلچل مچا دی
گلستاں میں رنگ و نوا ہو گئے ہم

ہوئے پھر ہمیں وجہِ تخلیقِ عالم
سزاوارِ ارض و سما ہو گئے ہم

دیا حُسن کو شیوۂ دل نوازی
پیامیٔ مہر و وفا ہو گئے ہم

جہاں بانیٔ و شہریاری سے بڑھ کر
دلوں پر بھی فرماں روا ہو گئے ہم

ہوئی علم و حکمت کی ہم پر وہ بارش
کہ نبّاضِ موج و ہوا ہو گئے ہم

ہوئے باخدا بن کے محرم حرم کے
صنم بن کے دیر آشنا ہو گئے ہم

فروزاں کیا شمعِ انسانیت کو
تو خلّاقِ ماہ و سہا ہو گئے ہم

کبھی سیر کی طورِ سینا کی ہم نے
کبھی قربِ جوئے خدا ہو گئے ہم

ہماری بلندیٔ تدبیر یہ تھی
کہ سیّارۂ ہر فضا ہو گئے ہم

مگر تھا نہ ہونا یہ ہونا ہمارا
کہ سب ہیچ ہے جب فنا ہو گئے ہم

زمیں تھی بہت عام سیماب پھر بھی
توارد سے عہدہ برا ہو گئے ہم

O
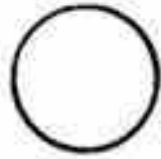
نہ مجھے ضرورتِ جامِ جم، نہ جہاں نما کی تلاش ہے
دلِ آشنا کی تلاش ہے، نگہِ رسا کی تلاش ہے

کبھی سنگِ در کی تلاش ہے، کبھی نقشِ پا کی تلاش ہے
تجھے اس تلاش سے فائدہ؟ کہ یہ ماسوا کی تلاش ہے

وہ فضا جو حُسن بدوش تھی، مری زندگی مرا جوش تھی
جو ہمہ جنوں ہمہ ہوش تھی پھر اُسی فضا کی تلاش ہے

مری اور تیری تلاش میں ہے سوال نقل اور اصل کا
مجھے پائے دوست کی جستجو تجھے نقشِ پا کی تلاش ہے

ہے عجیب فطرتِ آدمی نہیں چین اِس کو کسی طرح
کبھی مدعا سے گریز پا کبھی مدعا کی تلاش ہے

نہیں میں خرابِ شہنشہی نہیں کام تاج و کمر سے بھی
ہو نظر میں جس کی سکندری مجھے اُس گدا کی تلاش ہے

تو ہے مرگِ عشق سے بدگماں ہوس و ہوا سے سرگراں
تری زندگی نہیں جاوداں تجھے خود فنا کی تلاش ہے

جو وفا ہے تجھ میں تو حُسن پر نظرِ تلاش نہ صرف کر
جسے حُسن کہتے ہیں بے خبر! اُسے خود وفا کی تلاش ہے

وہ جمالِ جلوہ منتظر ہے "خود آشنائی" میں مستتر
کسی خودنگر کو تلاش کر جو خدا نما کی تلاش ہے

نہیں بے نیاز کی شان یہ کہ دعا کروں تو جزا ملے
جو بغیرِ عرض نواز لے، مجھے اُس خدا کی تلاش ہے

ترا سازِ نالہ خموش ہو تو وہ نغمہ جنتِ گوش ہو
کہ ہنوز زخمۂ حُسن کو دلِ بے صدا کی تلاش ہے

ہے مسرتوں کی بھی سزا کہ میں کاہشوں میں ہوں مبتلا
غمِ جاں رُبا کی، نہیں نہیں! — غمِ جاں فزا کی تلاش ہے

یہ غبارِ عظمتِ رفتگاں ابھی کیوں بنا نہیں کارواں؟!
یہ ہے کیوں جہاں میں رَواں دَواں اسے کس ہوا کی تلاش ہے

یہ سبک نگاہ، یہ کم نظر تگ ودَو میں جلوے کی ہے مگر
اسے سطحِ خاک پہ بیٹھ کر دُرِ بے بہا کی تلاش ہے

یہ خودی کے نشّہ میں باؤلے!۔ وہ اجارہ دارِ خدائی کے
ہیں یہاں خدا ہی خدا پڑے تجھے کس خدا کی تلاش ہے

ہو زمین کیسی ہی شعر کی، یہ خدا کا فضل ہے وارثیؔ
کوئی بات ڈھونڈ ہی لاؤں گا کہ مری بلا کی تلاش ہے

○
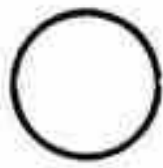
فطرت کی شوخیوں کا یہ دَور ترجماں ہے
اِک گردشِ نظر سے، عالم رواں دواں ہے
محدودِ دیر و کعبہ میری نظر کہاں ہے؛
مجھ کو تو ساری دنیا اُن کا ہی آستاں ہے
ہے قسمتِ زمیں ہی اک انقلابِ پیہم
جو پہلے آسماں تھا، اب بھی وہ آسماں ہے
باقی ہے حُسن جب تک، جب تک ہے عشق زندہ
میرے سکونِ دل کی ہر سعی رائیگاں ہے
رکھ اپنے دل کو زندہ پھر کر یقین اِس کا
ہستی بھی جاوداں ہے اور تو بھی جاوداں ہے
امکان انکشافِ اسرار ہو تو کیوں کر؟
وہ راز بن گیا ہے جو اُس کا رازداں ہے
کیفِ نظر پہ قائم ہو تازگی کا عالم
دنیا جواں رہے گی جب تک نظر جواں ہے
میری حدیثِ دل کی طولانیاں نہ پوچھو
ہر حرف ہے فسانہ ہر لفظ داستاں ہے

جس دن سے میں نے قیدِ آہنگ توڑ ڈالی
نغمہ وہ سُن رہا ہوں جو ساز میں نہاں ہے
ہے تجھ میں گُل وَشی بھی، حُسنِ شگفتگی بھی
اے پھُول چننے والے تو بھی تو گلستاں ہے
واقف ہے ذرّہ ذرّہ منزل کے راستوں سے
پس ماندہ راہ بھی اب سالارِ کارواں ہے
انساں نہار رہا ہے انسان کے لہو میں
اس شورِ ہاوہُو میں اللہ تو کہاں ہے
سیمابؔ کش مکش میں کاہش بجاں ہیں لاکھوں
ہندوستاں نہیں ہے قوموں کی کہکشاں ہے
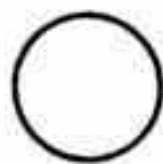
فرقِ ایمان و محبّت میں نہیں
ہو بھی تو میری شریعت میں نہیں
جو مقدّر ہے طلب اُس کی فضول
اُن سے وہ مانگ جو قسمت میں نہیں
پہلے اک دل میں تھے لاکھوں عالم
اب کوئی رنگ طبیعت میں نہیں
ڈوب کر دیکھ کبھی اشکوں میں
فاصلہ ناز و ندامت میں نہیں
سونپیے کس کو متاعِ غمِ دوست؟
ظرف کونین کی وسعت میں نہیں
ہے جبیں میں تو اک آشوبِ سجود
کچھ کشش ہی درِ دولت میں نہیں
تھی تری یاد ہی تک یادِ خدا
اب کوئی کیف عبادت میں نہیں
دل کی قسمت ہی میں ہے محرومی
ورنہ کیا آپ کی قدرت میں نہیں

حُسن دنیا میں ہے جب تک باقی
ترکِ دنیا مری نیّت میں نہیں
کعبے پہنچا تو یہ آواز آئی
لطف دوری میں ہے قربت میں نہیں
کوئی جلوہ نہیں ایسا سیماب
جو حجابِ بشریّت میں نہیں

متفرق اشعار

جبرِ فطرت سے ہوں مجبور مجاز
میں گنہگار حقیقت میں نہیں
وہ ہے انسان کی صورت میں نہاں
گو ہر انسان کی صورت میں نہیں

سنہ ۱۹۴۷ء

ایک عالم میں کہاں سب کی بسر ہوتی ہے
شام، پروانوں کی نظروں میں سحر ہوتی ہے
دل کو بے لفظ پیاموں کی خبر ہوتی ہے
ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے!
جن کی جلوؤں کے اُجالوں میں بسر ہوتی ہے
اُن کی اک شب میں کئی بار سحر ہوتی ہے
چشمِ باطن سے تماشائے حریمِ دل کر
کہیں یہ سیر بہ توفیقِ نظر ہوتی ہے
ہے دوراہا عدم و ہستی کا دشوار گزار
نہ اِدھر ہوتی ہے دنیا نہ اُدھر ہوتی ہے
جس سے کرتا ہے دل انسان کا کسبِ انوار
ایک ایسی بھی سحر قبلِ سحر ہوتی ہے
زندگی کو نہیں تسکینِ محبت حاصل
یوں تو ہونے کو بہ ہر حال بسر ہوتی ہے
وہ ملے مجھ سے تو اُن کی بھی بھر آئیں آنکھیں
دل ہی کو دل کی تباہی کی خبر ہوتی ہے

چھین لیتا ہے خدا اُس کا سکونِ خاطر
جس کو تسکین مری مدِّ نظر ہوتی ہے
انقلابات و حوادث سے نہ ہو بے پروا
کہیں اک حال میں بھی عمر بسر ہوتی ہے
نہ اُڑا خاک محبت میں رہِ وحشت کی
دل سے دل تک بھی تو اک راہگذر ہوتی ہے
ہائے وہ اُن کا تغافل وہ مری مجبوری!
صلح ہوتی نہیں منظور، مگر ہوتی ہے
محو ہیں جو ترے جلوؤں میں انھیں کیا معلوم
صبح ہوتی ہے کدھر، شام کدھر ہوتی ہے؟
ایک دل، دوسرے دل کا ہے یہاں محرمِ راز
ورنہ دنیا میں کسے، کس کی خبر ہوتی ہے
خوش ہوں سیماب میں تنقید سے کم بینوں کی
کچھ بلند اور مری فکر و نظر ہوتی ہے

○
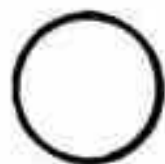
ہر طرف ایک ہی تصویر نظر آتی ہے
آپ کی جلوہ گرِ حُسن طلسماتی ہے
رات جب پچھلے پہر گیت کوئی گاتی ہے
سازِ دل سے بھی لگاتار صدا آتی ہے
جبرئیل اک مرا دیرینہ ملاقاتی ہے
میں ہوں انسان یہ میرا شرفِ ذاتی ہے
دفعتاً موت ہی انسان کو کیا آتی ہے
زندگی کی بھی جو کروٹ ہے مفاجاتی ہے
توبہ توبہ شبِ غم کے متواتر حملے
اک قیامت ہے جو آتی ہے گزر جاتی ہے
عشق صدیوں سے ہے بے معنی و مقصد اک لفظ
جو حکایت ہے محبت کی روایاتی ہے
بے تعلق ہوں مگر دل میں تڑپ ہے اُن کی
ابھی بالواسطہ اک چھیڑ چلی جاتی ہے
سر جھکانے دے قدم پر کہ سبک سر ہو لوں
زندگی ورنہ بڑا بوجھ بنی جاتی ہے

مطلعِ عشق کہاں حُسن کم آویز کہاں!
آپ کرتے ہیں وفا، شرم مجھے آتی ہے
کیا کوئی اور اُمیدوں کا ٹھکانہ ہی نہیں
سارا عالم اُسی اک در پہ مناجاتی ہے
مَوت کے بعد بھی بے رُوح نہیں ہوں اے دوست
کہ مرے دل میں تری یاد رہی جاتی ہے
اب بھی آتی ہے مجھے بوئے وفا اے سیماب
جانبِ "جھنگ" سے جب بادِ سحر آتی ہے
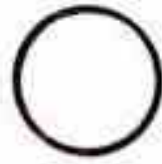
یہ کیا کمالِ جذبِ نظر دیکھتا ہوں میں
جلوہ نما کو جلوہ نگر دیکھتا ہوں میں

لڑتی ہوئی نظر سے نظر دیکھتا ہوں میں
وہ مجھ کو دیکھتے ہیں، جدھر دیکھتا ہوں میں

بازیچہ جہاں میں جدھر دیکھتا ہوں میں
اپنے ہی شعبدات نظر دیکھتا ہوں میں

مجبوریٔ خرابِ نظر دیکھتا ہوں میں
موسیٰ کو اب بھی طور ہی پر دیکھتا ہوں میں

اے میرے چاند اے مری خلوت کے آفتاب
تیری ہی راہ شام و سحر دیکھتا ہوں میں

اللہ رے نشتریت پایانِ انتظار!
ہر سانس خونِ یاس میں تر دیکھتا ہوں میں

جس شاخ پر جلا تھا مرا آشیاں وہاں
اب تک ہجومِ برق و شرر دیکھتا ہوں میں

حُسن اضطراب دل میں اُٹھاتا ہے سیکڑوں
حالانکہ صرف ایک نظر دیکھتا ہوں میں

فطرت کو بھی یہاں نہیں آزادیاں نصیب
اِس کو اسیرِ شام و سحر دیکھتا ہوں میں

میرے تصورات کی سجدہ گری نہ پوچھ
اکثر جبینِ حُسن پہ سر دیکھتا ہوں میں

اللہ رے جو میری دعائیں قبول ہوں
ان کو بھی اُن کے زیرِ اثر دیکھتا ہوں میں

اُس وقت تک ہے یہ خلشِ پردہ و حجاب
جب تک انھیں بقیدِ نظر دیکھتا ہوں میں

لینا ہے انقلاب سے پھولوں کا خوں بہا
کلیوں کو آج سینہ سپر دیکھتا ہوں میں

ہوتی ہے ختم سرحدِ 'اِلّا' و 'لا' جہاں
اُس سے پرے مقامِ نظر دیکھتا ہوں میں

سیماب بے سبب نہیں دامن کشی مری
فتنے میانِ راہگذر دیکھتا ہوں میں
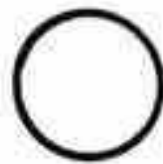
پھولوں سے حجاب اُٹھے، سبزہ بھی نکھر آیا
پھر یاد تری آئی، پھر وقتِ سحر آیا
بے راہنما آیا بے راہگذر آیا
گو دل میں ترے آنا مشکل تھا، مگر آیا
آئینۂ دل میں یوں وہ شعبدہ گر آیا
پیوستہ رہا پنہاں، پیوستہ نظر آیا
وہ بانگِ اذاں آئی، وہ پیکِ سحر آیا
بس ماندہ مُسافر چل پیغامِ سفر آیا
میں دیر و کلیسا سے بے سجدہ گزر آیا
سر جھک ہی گیا لیکن جب آپ کا در آیا
گو طور سے میں واپس آزردہ نظر آیا
آثارِ تجلّی کو تسلیم تو کر آیا
پہلے وہ تصوّر میں تا حدِّ نظر آیا
لی ہنس کے پھر انگڑائی اور دل میں اُتر آیا
ساقی تری محفل تھی صد جنّت و صد کوثر
لب تشنہ گیا تھا میں اور بالبِ تر آیا

قربت میں بھی سرشاری دوری میں بھی سرمستی
دیوانہ بہ ہر حالت دیوانہ نظر آیا
یہ دردِ محبت کی کیفیتِ مجمل ہے
مرنے کا مزہ آیا۔ اور زندگی بھر آیا
آ منزلِ اُلفت میں محرومِ خرد ہوکر
اب تک جو یہاں آیا بے علم و خبر آیا
صورت کدۂ دنیا اور حُسنِ نظر میرا
ہر نقش کے پردے میں نقاش نظر آیا
آخر وہ مرے دل میں خندہ بجبیں آئے
رو رو کے دُعا مانگی ہنس ہنس کے اثر آیا
وہ عرش سے دیتے ہیں اب دعوتِ نظارہ
اے ذوقِ نظر وقتِ معراج نظر آیا
میرے لیے دنیا بھی میرے لیے عقبیٰ بھی
جس گھر میں غرض آیا میں اپنے ہی گھر آیا
کثرت متحیّر ہے اس وحدتِ جلوہ پر
دنیا کو نہیں تنہا موسیٰ کو نظر آیا
پوشیدہ وہ دل میں تھا ظاہر کی نگاہوں سے
جب دل ہی کی نظروں سے دیکھا تو نظر آیا
بے ساختہ یاد آئی بے بال و پری اپنی
جب کوئی مرے آگے ٹوٹا ہوا پر آیا
ہر وقت کا نظارہ ہر وقت کی محویّت!
ایک ایسا زمانہ بھی بے شام و سحر آیا

جلوہ گہہِ جاناں کو ہم لوٹ کے لے آئے
لوٹی جو نظر جلوہ ہمراہِ نظر آیا
ہر قطرۂ خوں میرا تحلیل ہوا لیکن
تصویرِ محبت میں اک رنگ تو بھر آیا
اللہ رے بے دردی دستورِ محبت کی
الزامِ وفا آخر سیماب ہی پر آیا

○

پیام روح بن کر عشق کا پیغام آتا ہے
مگر دل جن کے زندہ ہیں انھیں کے نام آتا ہے
وہ کام آئے مرے تو اُن پہ کیا الزام آتا ہے
مثل ہے آدمی کے آدمی ہی کام آتا ہے
تعجب کیا جو بزمِ حُسن سے ناکام آتا ہے
جو آتا ہے اسیرِ آرزوئے خام آتا ہے
محیطِ عشق میں پہلا قدم ہے آخری منزل
یہاں ہر آنے والا فارغِ انجام آتا ہے
نہ جانے ایسی کیا بجلی بھری ہے چند حرفوں میں
تڑپ جاتا ہے دل جب لب پہ اُن کا نام آتا ہے
نہیں ہے وقت کوئی موت کے اور دل کے آنے کا
یہ وہ طوفاں ہے جب آتا ہے بے ہنگام آتا ہے
چمن میں انقلاب آیا، ہوا بدلی، فضا بدلی
خدا چاہے تو اب صیاد زیرِ دام آتا ہے
میں ہر اک سانس میں فردوسیت محسوس کرتا ہوں
وہ جب لے کر سکونِ جانِ بے آرام آتا ہے

مجھے حیرت ہے اُس کی احتیاط و پردہ داری پر
تصوّر میں بھی قبلِ صبح بعدِ شام آتا ہے
میں کیا کہہ کر پکاروں کس طرح آواز دوں اُس کو؟
تصوّر میں یہ کس کا جلوۂ بے نام آتا ہے؟
طلب جس کی ہے جس کا راستہ ہے جس کی منزل ہے
وہ بہرِ دستگیری ہر قدم ہر گام آتا ہے
محبّت میں انھیں کے ذکر سے تسکین ہوتی ہے
انھیں کا نام ایک ایسا ہے جو سَو کام آتا ہے
ہے دقّتِ واپسیں اٹکی ہوئی ہے آخری ہچکی
میں ہوں مجبور اب لب تک کسی کا نام آتا ہے
مصیبت ہے محبّت میں اگر کام اُس سے پڑ جائے
جو دل لے اور پھر پوچھے کہ دل کس کام آتا ہے؟
نہیں سیماب میں محتاجِ جام و شیشہ و ساغر
براہِ راست دل تک بادۂ الہام آتا ہے

○
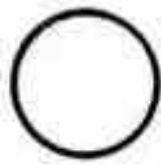
کیا دیا ہے ذوقِ الفت، خوش رہو
دل پرائے بس میں دو اور غم سہو
گر یقیں مجھ پر نہیں ہوتا، نہ ہو
تم نے یہ کیا کہہ دیا پھر تو کہو
آبرو چاہو تو غم کے آنسوؤ
اب کوئی دن اُن کی آنکھوں سے بہو
وقت تنہائی میں مشکل سے کٹے
تیرے وعدوں کا سہارا گر نہ ہو
دل بھی میرا ہی لیا تھا زندہ باد
جان بھی میری ہی لی، جیتے رہو
کیا نظر میری خموشی پر نہیں
اے بہاروں کے رسیلے چہچہو!
چند مٹی کے کھلونوں پر غرور
اے جہانِ خاک کے شاہنشہو!
تم کو اپنی خو بدلنی چاہیے
دل بدل جائے کہیں ایسا نہ ہو
مل رہے ہیں وقت دونوں شام کو
اک دُعا مانگوں جو تم آمیں کہو
چھوڑ دو سیماب سب دنیا کے کام
بس انھیں کے منتظر بیٹھے رہو

○

کہاں جائے نظر اور جائے تو جائے کدھر ہو کر
وہ خود بیٹھے ہوئے ہیں حائلِ حدِّ نظر ہو کر
ہزاروں سوز در دل لوٹ آئے طور پر ہو کر
یہ تم نے کیا لگا دی آگ، اک دن جلوہ گر ہو کر
حوادث کے بھنور میں بیٹھ جا سینہ سپر ہو کر
یہی موجیں کبھی ساحل بنیں گی، مختصر ہو کر
تماشائی ہے ہر ذرّے کا خاکِ رہگذر ہو کر
یہ تیری پست بینی، اِس قدر بالغ نظر ہو کر!
ہمیشہ مشکلوں کی انتہا ہوتی ہے آسانی
شبِ غم صبح بن جاتی ہے بالآخر بسر ہو کر
ہنسی آتی ہے مجھ کو اپنے اِس سودائے ناقص پر
کہ تیرے دیکھنے کی آرزو ہے خود نگر ہو کر
وہ آزادی سے کر سکتا نہیں پرواز گلشن میں
جو بیٹھا ہے اسیرِ احتیاجِ بال و پر ہو کر
بصد مشکل قریبِ آستانِ دوست پہنچا ہوں
حرم سے دور ہو کر، بُت کدے سے دور تر ہو کر

ترا دل کیا خدائی بھر کے دل اک روز دھڑکیں گے
نوائے عشق گونجے گی نوائے کارگر ہو کر
نہ ہو محوِ تماشا خلوتِ محدودِ ہستی میں
گزر جا وسعتِ کونین کی حد سے نظر ہو کر
اسی پر بوالہوس کو زعم ہے طوفاں اٹھانے کا
بہت رویا تو دامن رہ گیا اشکوں میں تر ہو کر
تصور کا یہ ادنیٰ کھیل ہے اے حسنِ آوارہ!
رہی برسوں تری تصویر پابندِ نظر ہو کر
نظر ہو چارسو حیراں، یہ توہینِ تماشا ہے
میں اب کس کی طرف دیکھوں، ترا جلوہ نگر ہو کر
یہ ہے طرفہ تصرف بے قراروں کے مزاروں کا
ٹھہر جاتا ہے دم بھر جو نکلتا ہے اِدھر ہو کر
تجھیں کو مانگتا ہوں تم سے، وہ ضدی بھکاری ہوں
مرے دستِ دعا میں خود ہی آجاؤ اثر ہو کر
جو دل ٹوٹے تو ہر ٹکڑے سے دل کے پھر بنا اک دل
ہے کیوں رنجِ شکستِ آئینہ، آئینہ گر ہو کر؟
کوئی طوفاں نیا اُٹھتا ہے یا بجلی چمکتی ہے
کسی دن طور پر ہم بھی تو دیکھیں جلوہ گر ہو کر
نہیں جس میں تحمل مشکلاتِ راہِ منزل کا
وہ پچھتائے گا اے سیماب میرا ہم سفر ہو کر

○
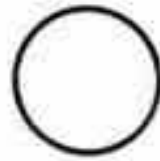
تمنا کو کوئی نسبت نہیں اغراض بے جا سے
مزاجِ حُسن کو دھوکے نہ دے جھوٹی تمنا سے

محبت کی گوارائی بڑھا قلبِ شکیبا سے
تمنا کا سکوں بہتر ہے طوفانِ تمنا سے

توقع دورِ مستقبل کی بھی کیا چیز ہوتی ہے
غمِ امروز کیف اندوز ہے اُمیدِ فردا سے

تمہارا اور میرا ساتھ اے دنیا پرستو کیا؟
تمہیں رہنا ہے دنیا میں مجھے جانا ہے دنیا سے

مری تاریکیٔ خلوت بھی وہ اک دن مٹا دے گا
مٹا دی جس نے دل کی تیرگی نورِ سویدا سے

گوارائی محبت میں نشاطِ غیر فانی ہے
خوشی کو کیوں بدل لوں اپنے غم ہائے گوارا سے

پسِ انکار بھی جلوہ گری ممکن ہے جس پر ہو
سمجھتا ہوں کہ "الّا" جھانکتا ہے پردۂ "لا" سے

یہ کیسا ذوقِ جلوہ تھا نہ لی پھر جس نے انگڑائی
بنا اب تک نہ کوئی طور خاکِ گورِ موسیٰ سے

تصور سے ہو یا ہو حُسن سے مقصد اُجالا ہے
جلے گی کیوں مری شمعِ حرم صبحِ کلیسا سے
وضو کرتا ہے میرا ظرفِ عالی حوضِ کوثر پر
بہ پاسِ خاکساری پاؤں دُھلواتا ہوں جمنا سے
ہوا تھا حُسن نادم عشق بھی کچھ تو خجل ہوتا
لیا بدلہ نہ کیوں یوسف نے دامانِ زلیخا سے
ندیدوں کی طرح ساغر پہ جھک کر میں نہیں پیتا
اُٹھا کر سر پیا کرتا ہوں مینائے ثریا سے
کبھی شاید وہ آجائیں تماشائے جنوں کرنے
اگر وحشت اجازت دے تو گھر اچھا ہے صحرا سے
کرے توہینِ جلوہ طالبِ جلوہ کی نا ممکن
کوئی پتھر گرا ہوگا فرازِ طورِ سینا سے
کریں شکوہ نہ اہلِ خُلد خالی ہاتھ آنے کا
یہی کیا کم غنیمت ہے کہ لوٹ آیا ہوں دنیا سے
مری تقلید اے سیماب ہے تدبیر منزل کی
نشانِ راہ ملتا ہے مرے نقشِ کفِ پا سے

سنہ ۱۹۳۸ء

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے وٹس ایپ پر رابطہ
کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067

زبانِ خلق پہ خاموش داستاں نہ بنے
کوئی کسی کا محبت میں رازداں نہ بنے

اُسے خبر ہو کوئی اور رازداں نہ بنے
میں چاہتا ہوں غمِ عشق چیستاں نہ بنے

چمن میں خاکِ چمن سے ہوا ہوں میں پیدا
چمن کی خاک سے کیوں میرا آشیاں نہ بنے

وہ جادہ کیا جو نہ پائے طلب سے ہو پامال
وہ راہ کیا جو گذرگاہِ کارواں نہ بنے

میں خاکسار ہوں پھر مجھ سے سرگرانی کیوں؟
ذرا زمین سے کہہ دو کہ آسماں نہ بنے

پہنچ گئے سرِ منزل خیال سے پہلے
خدا کا شکر کہ ہم گردِ کارواں نہ بنے

زمین تنگ ہو یا مرد پر، مجال نہیں
وہیں حیات کا مرکز بنا، جہاں نہ بنے

جسے نہ تجربہ ہو رنجِ نارسائی کا
وہ کارواں میں مرے میرِ کارواں نہ بنے

یہ بند و بست بھی ہے ناگوارِ آزادی
بلند آج سے دیوارِ گلستاں نہ بنے
ہماری موت تھی انسانیت کی مرگِ دوام
جہاں مٹے تھے ہم انسان پھر وہاں نہ بنے
گداز بیہم دل سے مجھے ہے اندیشہ
نئی خلیج مرے اُن کے درمیاں نہ بنے
جبینِ عرش پہ پہنچے مری جبینِ نیاز
جو سنگِ راہ ترا سنگِ آستاں نہ بنے
تم اُن کی بزم سے خاموش اٹھ چلو سیماب
وہاں بگاڑ ضروری نہیں جہاں نہ بنے
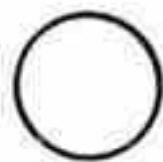
ہر چند انقلاب مجھے سازگار ہے
پھر بھی نظر سکوں کے لیے بے قرار ہے
کر، یا نہ کر یقین، تجھے اختیار ہے
یہ جلوۂ بہار، سراب بہار ہے
ہر دورِ گلستاں پہ تجھے اختیار ہے
تو کیوں خرابِ فکرِ خزاں و بہار ہے
رنج و خوشی کا دل ہی پہ دار و مدار ہے
دل کو سکوں ہو تو خزاں بھی بہار ہے
رازِ فسردگیٔ چمن آشکار ہے
بے موجِ خوں کہ سرخیٔ صبحِ بہار ہے
قبضہ نہیں ہے دولتِ کونین پر نہ ہو
خوش ہوں کہ تیرے دل پہ مجھے اختیار ہے
ہوں اہتمامِ ترکِ تعلق پہ مطمئن
گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے
میں انقلابِ حال پہ قانع نہیں ہنوز
جاری ابھی تو گردشِ لیل و نہار ہے

اے دوست مجھ کو فکرِ حیات و ممات کیا
میرے نفس نفس پہ تجھے اختیار ہے
گلچیں یہی ہے ضامنِ اہمیّتِ بہار
اک خدشۂ خزاں جو شریکِ بہار ہے
سیماب دل نہیں مری آغوشِ سرد میں
مرحوم دورِ رفتہ کی اک یادگار ہے

○
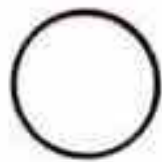
افسانے اُن کے محفلِ امکاں میں رہ گئے
کچھ روز وہ بھی پردۂ انساں میں رہ گئے
سَو بار ہاتھ اُلجھ کے گریباں میں رہ گئے
اب کتنے دن قدومِ بہاراں میں رہ گئے!
کافور سے بھی عشق کی ٹھنڈی ہوئی نہ آگ
چھالے لگے ہوئے دلِ سوزاں میں رہ گئے
جتنے نشاں جنوں کے تھے لوٹ آئے میرے ساتھ
ہاں وہ نقوشِ پا جو بیاباں میں رہ گئے!
آزادیٔ وطن کی جنوں کاریاں نہ پوچھ
کچھ دن کو اہلِ ہوش بھی زنداں میں رہ گئے
کوئی مرا فسانۂ غمگیں نہ پڑھ سکا
سب ہو کے محوِ عبرتِ عنواں میں رہ گئے
تھے دورِ انقلاب میں ایسے بھی کچھ طیور
صحرا سے اُڑ کے آئے گلستاں میں رہ گئے
دل میں جو چند عارضی جذبے خوشی کے تھے
وہ بھی دبے ہوئے غمِ پنہاں میں رہ گئے

نتھری ہوئی ہے خون میں آزادیٔ وطن
اچھے رہے وہ لوگ جو زنداں میں رہ گئے

کچھ اُن کے التفات نے زحمت نہ کی قبول
کچھ نقص میرے حالِ پریشاں میں رہ گئے

لاکھوں شکستہ کشتیاں اُن کی بہا نہیں
دل ٹوٹ کر جو شورشِ طوفاں میں رہ گئے

فطرت کبھی نہ لالہ و گل کی بدل سکی
آ آ کے انقلاب گلستاں میں رہ گئے

اے صورِ حشر دے نہ ہمیں دعوتِ خرام
اب رہ گئے تو کوچۂ جاناں میں رہ گئے

توفیق روز ہوتی ہے کس کو گناہ کی!
خالی ورق بھی دفترِ عصیاں میں رہ گئے

یا رب کچھ اور دے مجھے کونین کے سوا
یہ تو سما کے گوشۂ داماں میں رہ گئے

پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کُل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ رگِ جاں میں رہ گئے

سیماب جن سے تھا مرے مشرب کو اختلاف
کچھ ایسے شعر بھی مرے دیواں میں رہ گئے

○
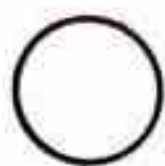
یہ صبح و شام، یہ فصلِ شباب کیا معنی؟
ہر ایک لمحہ نیا انقلاب کیا معنی؟
جو تو ہے، میں ہوں وہی فرق حُسن و عشق کے ساتھ
تو پھر یہ مجھ سے ترا اجتناب کیا معنی؟
ہر ایک شعر مرا ترجمانِ مشربِ تھا
لحد میں مجھ سے سوال و جواب کیا معنی؟
تو سازِ دل ہی پہ خلوت میں چھیڑ لے نغمے
نگار خانہ و چنگ و رباب کیا معنی؟
نوازشِ ستمِ بے شمار کیا کم ہے؟
گذارشِ کرمِ بے حساب کیا معنی؟
حیات و موت پہ ہے جبر و اختیار اُن کا
خیال و فکرِ عذاب و ثواب کیا معنی؟
اگر تو چاہے اُلٹ دے حجابِ ہستی بھی
نظر میں دم ہے تو عذرِ نقاب کیا معنی؟
گناہگار کو دے کر گناہ کی توفیق
گناہگار ہی سے احتساب کیا معنی؟
خدا کی مصلحتیں راز ہی سہی سیماب
مگر ستائے ہوؤں پر عتاب کیا معنی؟

متفرق اشعار

تباہی ہو کہ بربادی، تلافی سب کی آساں ہے
یہاں ہر بات ممکن ہے، یہ دُنیا بزمِ امکاں ہے
شکستِ گُل سے سازِ گلکدہ برہم نہیں ہوتا
نہ جانے میرا دل ٹوٹا تو دُنیا کیوں پریشاں ہے؛

○
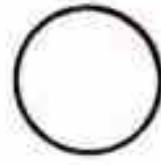
تاراجئ وطن کی مصیبت نہ پوچھیے
کس پیرہن میں آئی قیامت نہ پوچھیے

کیا کیا مآل سے ہے ندامت نہ پوچھیے
کیوں دی تھی انقلاب کو دعوت نہ پوچھیے

لب پر ہیں احتیاط کی مہریں لگی ہوئی
کیا چاہتا ہے ذوقِ طبیعت نہ پوچھیے

بنیاد ہر عمل ہے فقط اعتبار پر
بیچارگئ ذہنِ عبادت نہ پوچھیے

یہ شورِ ممکنات یہ بے اختیاریاں!
صبرِ حیات و جبرِ مشیّت نہ پوچھیے

ممنونِ انقلاب ہے آزادئ چمن
لیکن یہ واقعہ بصراحت نہ پوچھیے

جنّت ہے ابتدائے تصوّر کی اک کڑی
رنگینئ مزاجِ محبّت نہ پوچھیے

بس مختصر یہ ہے کہ محبت نہ کیجیے
تفصیل تجرباتِ محبّت نہ پوچھیے

اب تک حدیثِ عشق میں جذب و اثر نہیں
بے مائیگیٔ حرف و حکایت نہ پوچھیے
ہیں ٹھوکروں میں حسن کی ٹوٹے دلوں کے ڈھیر
بے قدریٔ متاعِ محبت نہ پوچھیے
جتنی حقیقتیں تھیں وہ سب خواب ہو گئیں
تاریکیٔ مآلِ محبت نہ پوچھیے
برسات اور شدّتِ سوزِ فراقِ دوست!
بوندوں میں کس قدر تھی حرارت نہ پوچھیے
تعمیر میں حیات کی جو کام آ گیا
اُس ذرّۂ حقیر کی قیمت نہ پوچھیے
گزُری فریبِ مہر و وفا میں تمام عمر
سیماب وجہِ ترکِ محبت نہ پوچھیے

○

دل کا مقام ہے بلند، تو نہیں آشنائے دل
دل میں ہے کائنات بند، دل ہی میں ہے خدائے دل
اور بھی کچھ امانتیں پیش ہوئیں بجائے دل
ہمتِ مشتِ خاک نے کچھ نہ لیا سوائے دل
کہہ بزبانِ خامشی دل ہی سے ماجرائے دل
دل کا حقیقت آشنا کوئی نہیں سوائے دل
حُسن ہے صرف رنگ و بو، فانی و غیر جاوداں
دل سے ہے عشق کی حیات عشق سے ہے بقائے دل
شورشِ دہر میں کوئی، کان نہیں صدا شناس
گونج رہا ہے رات دن، سازِ غزل سرائے دل
دل سے حجاب اُٹھا کبھی، دل ہی سے دل ملا کبھی
دل ہی پہ آزما کبھی، عشوۂ دل رُبائے دل
اُس کی نظر سے گر گئی، شوکت و شانِ خسروی
جس کو خدا نے بخش دی دولتِ بے بہائے دل
کون و مکاں کی سیر کر، چاہے جہاں کی سیر کر
ہے ترے پاس بے خبر، جامِ جہاں نمائے دل

تنگ دلیِ حُسن سے بھیک نہ مانگ دید کی
کرلے نظر کو خوگرِ جلوۂ دل کشائے دل
دل ہی کی قوتوں سے ہے کشف و کشودِ ہست و بود
کارکشائے اہلِ دل کوئی نہیں سوائے دل
آب و ہوائے دل کو ہے گرمیٔ عشق سے ثبات
گریۂ شامِ آب و رنگ، آہِ سحر ہوائے دل
پیکرِ آب و خاک کو سوزِ تمام کر عطا
عشق کے کام کا نہیں، شعلۂ نارسائے دل
دل کو سمجھ نہ مختصر ظرف پہ اس کے غور کر
ارض و سما پہ ہے محیط، وسعتِ تنگنائے دل
سینے میں جس کے دل ملے دل اسے اپنا سونپ دے
دل نہیں بہرِ ماسوا، دل ہے فقط برائے دل
دل ہے تو گرم ہوگی پھر محفلِ عشق و آرزو
ایک ذرا سی چھیڑ سے کیوں ہے زباں پہ ہائے دل!
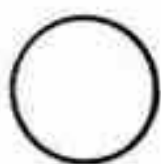
حال کے ہاتھوں سے مستقبل کا دامن تھام لے
مل گئی ہے تجھ کو آزادی تو اس سے کام لے
عشرتِ آغاز میں یوں تو زمانہ ہے شریک
کیا کوئی ایسا بھی ہے جو ذمّۂ انجام لے
ماضیٔ مرحوم کی ناکامیوں کا ذکر چھوڑ
زندگی کی فرصتِ باقی سے کوئی کام لے
دن سکوں سے تیر کر دے، رات اطمینان سے
صبح سے لے اک نوید اک شام سے پیغام لے
کر یقیں بے ہوش کی دنیا خرابِ غم ہنوز
جامِ مے جب ہاتھ میں اک خستۂ ایّام لے
ان حجابوں سے تجھے باہر میں لاؤں گا ضرور
پردۂ اسلام لے یا پردۂ اصنام لے
مادّیت چاہتی ہے غارتِ دنیا و دیں
وقت باقی ہے ابھی بندے خدا کا نام لے
منزلِ مقصود ہے پیچیدہ و دور و دراز
وائے وہ رہرو کہ جو ہر گام پہ آرام لے

زورِ طوفانِ حوادث میں نہ بہہ جاؤں کبھی
تھام لے یارب مری کشتی کا لنگر تھام لے

غور کر مایوسِ آزادی وہ ہوگا کس قدر
آشیاں کو چھوڑ کر جو خود پناہِ دام لے

یوں مری آنکھوں میں ہے تصویرِ رنگینِ شباب
آب جو میں جیسے انگڑائی عروسِ شام لے

زندگی سیماب ہو آئینہ دارِ زندگی
کاش ایسی کوئی کروٹ گردشِ ایام لے
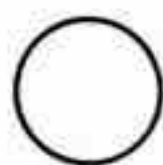
موجزن اک جذبۂ عالم پناہی دل میں ہے
میں ہی کیا مشکل میں ہوں سارا جہاں مشکل میں ہے
جانِ ہیجانِ تمنا سے بڑی مشکل میں ہے
ایک حسرت ہے لبوں پر ایک حسرت دل میں ہے
کیا وہ پھر آنے کو اس اُجڑی ہوئی محفل میں ہے
آج عالم طور کا سا جلوہ گاہِ دل میں ہے
یاد آیا ہے کہ تھی ہر سانس معمورِ نشاط
اب تو ویرانی ہی ویرانی جہانِ دل میں ہے
حُسن محتاطِ نمایش عشق مشتاقِ نمود
پردہ در پردہ نشیں کے ساتھ ہی محمل میں ہے
کاش یہ دشواریٔ جادہ نہ ہوتی پاشکن
وہ کشش راہی میں ہوتی جو کشش منزل میں ہے
اک دلِ پُرسوز و حیراں ہی کی گنجایش نہیں
شمع بھی محفل میں ہے آئینہ بھی محفل میں ہے
ڈھونڈنے والے اُسے منزل بہ منزل کو بکو
پہلے یہ معلوم کر تو کون سی منزل میں ہے

شورشِ ساحل میں کیا امن و سکوں کی جستجو
یہ بھی اک طوفاں ہے جو پیراہنِ ساحل میں ہے
رازِ ہست و بود کا ادراک تو مجھ کو نہیں
صرف اتنی ہے خبر وہ دل میں تھا اور دل میں ہے
قوّتِ تخلیق کے بس میں نہیں شاید یہ چیز
آج تک ظرفِ محبّت انتظارِ دل میں ہے
دے دے اے یارب بقدرِ ظرفِ انساں وسعتیں
مانگ کر مجھ کو تری دنیا بڑی مشکل میں ہے
حال میں سیماب مستقبل کی تابانی نہیں
کارواں ہستی کا شاید آخری منزل میں ہے

○
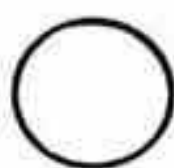
سبو پر جام پر شیشے پہ پیمانے پہ کیا گزری
نہ جانے میں نے توبہ کی تو میخانے پہ کیا گزری

ملیں تو نازانِ منزلِ مقصود سے پوچھوں
گذرگاہِ محبت سے گزر جانے پہ کیا گزری

کسی کو میرے کاشانے سے ہمدردی نہیں شاید
ہر اک یہ پوچھتا ہے میرے کاشانے پہ کیا گزری

نہ ہو جو زندگی انجام وہ وجدانِ ناقص ہے
حضورِ شمع بعدِ وجد پروانے پہ کیا گزری

بتائیں برہمن اور شیخ اُن کی خانہ جنگی میں
خدا خانے پہ کیا بیتی صنم خانے پہ کیا گزری

تو اپنے ہی مآلِ سوزِ غم پر غور کر پہلے
تجھے اس سے نہیں کچھ بحث پروانے پہ کیا گزری

کسی حکمت سے کر دے کوئی گویا مرنے والوں کو
یہ راز اب تک ہے سربستہ کہ مرجانے پہ کیا گزری

تری ہر سو تجلّی اور میری ہر طرف نظریں
تجھے تو یاد ہوگا آئینہ خانے پہ کیا گزری

زباں مُنہ میں ہے، عرضِ حال کر تو نے تو دیکھا ہے
کہ تجھ سے ضبط و خاموشی سے پروانے پہ کیا گزری

وہ کہتا تھا خدا جانے بہار آئے تو کیا گزرے
خدا جانے بہار آئی تو دیوانے پہ کیا گزری

یہ ہے سیماب اک ناگفتہ بہ افسانہ کیا کہیے
وطن سے کنجِ غربت میں چلے آنے پہ کیا گزری
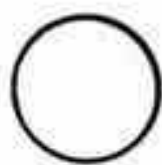
اتفاقاتِ نظر تھے کہ اُدھر سے گزرے
آہ، وہ چند مناظر جو نظر سے گزرے

آدمی اور قیودِ تن و سر سے گزرے
کیا فرشتے تھے جو اس راہگذر سے گزرے

مختلف راستوں کا مرکز و مرجع تو تھا
تیری ہی راہ تھی جس راہگذر سے گزرے

بحرِ غم تا کمر آیا بھی تو کیا خاک آیا
آبرو ہے اُسی پانی کی جو سر سے گزرے

اے زہے عالمِ یک رنگ شبستانِ لحد
آج ہم مرحلۂ شام و سحر سے گزرے

میرے صحرائے جنوں میں نہیں ایسا کوئی خار
جو کفِ پا میں چُبھے اور نہ سر سے گزرے

تنگ و محدود ہے پروازگہِ فکر و نظر
جس پہ سب بند ہوں رستے وہ کدھر سے گزرے

کسی انساں کی تحقیر کرے کیوں انسان
اپنا عالم اگر اپنی بھی نظر سے گزرے

کوئی افسانہ ہو بن جائے گا افسانۂ دل
شرط یہ ہے کہ محبت کی نظر سے گزرے
ساری دنیا سے بہت دور ترا گھر نکلا
ساری دنیا سے گزر کر ترے در سے گزرے
کر دیا سب کو بلندئ نظر نے نظری
جتنے جلوے نگہِ سیر نگر سے گزرے
تھا کہاں وقت کہ ہستی کے فسانے پڑھتے
صرف عنوان ہی عنوان نظر سے گزرے
کیسی پرواز، کچھ اس ڈھب سے کیا مجھ کو اسیر
کہ ہوا تک بھی نہ ہو کر کسی پر سے گزرے
اپنی رودادِ محبت پہ نگاہِ تنقید
نہیں معلوم یہ کس کس کی نظر سے گزرے
نالۂ شبگیر کیا تو نے تو کیا مارا تیر
نالہ وہ ہے جو گریبانِ سحر سے گزرے
منزل اُس کی ہے جو منزل سے رہے مستغنی
طلب اُس کی ہے جو بچ کر ترے در سے گزرے
یہ مرا گفتۂ بے کیف و پریشاں سیماب
کاش اُن کی نظرِ کیف اثر سے گزرے
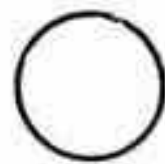
سب ہی پوچھتے آتے ہیں وطن کیوں چھوڑا؟
کیا بتائے انھیں گلچیں کہ چمن کیوں چھوڑا؟
جس میں انگڑائیاں لیتی تھی حیاتِ انساں
نئی دنیا نے وہ دستورِ کہن کیوں چھوڑا؟
حشر میں ہوتی نہ رسوا مری عریاں خیزی
مجھے لے آئے فرشتے تو کفن کیوں چھوڑا؟
سرگرانی کا گلہ اب ہے تکلف سے فضول
حسن نے پہلے ہی بے ساختہ پن کیوں چھوڑا؟
میں جنوں پیشہ و آوارہ قدم تھا لیکن
تم نے دامن مرا، یارانِ وطن کیوں چھوڑا؟
حق و ناحق میں بدستور اک آویزش ہے
عقل نے ضابطۂ دار و رسن کیوں چھوڑا؟
اگر افسردگی و مُردہ دلی قسمت تھی
تو نے زندہ مجھے اے دورِ فتن کیوں چھوڑا؟
انقلاب اس کا ذرا سوچ کے دے کوئی جواب
پوچھنے آئی ہے غربت کہ وطن کیوں چھوڑا؟

اے قضایہ ہے شہیدانِ رضا کی تو ہین
خاک اور خون میں غلطاں سر و تن کیوں چھوڑا؟
یہ سزا ہے کہ پریشان پھرے بوئے چمن
حرم نسترن و نسرین و سمن کیوں چھوڑا؟
مشرباً میرے مقدر میں اگر زمزم تھا
تو مجھے لا کے لبِ گنگ و جمن کیوں چھوڑا؟
آشیاں اب بجز اک شعلۂ مُردہ کیا ہے!
میں نے یہ داغ سرِ شاخِ چمن کیوں چھوڑا؟
کوئی حالاتِ وطن کا نہیں پُرساں سیماب
سب یہی پوچھتے آتے ہیں وطن کیوں چھوڑا؟

○
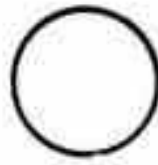
لے چکا ہوں میں ٹکر، ہر نئے زمانے سے
احتیاط اے دنیا میرے آزمانے سے

صرف ایک مقصد تھا زندگی مٹانے سے
تھوڑی دیر سو لیتے موت کے بہانے سے

نیستی و ہستی میں ضد ہے اک زمانے سے
مطمئن نہیں فطرت آدمی بنانے سے

بدگماں ہے اک دنیا عشق کے فسانے سے
بات بڑھ گئی آخر اُن کے مسکرانے سے

اُڑ گئے کبھی تنکے گر پڑی کبھی بجلی
کھیلتی رہی فطرت میرے آشیانے سے

ہو کسی طرح تعمیر خالقِ خرابی ہے
اہمیت قفس کی ہے میرے آشیانے سے

شان دیکھ او کافر، سجدۂ محبت کی
کائنات جھکتی ہے میرے سر جھکانے سے

میں نے اپنے سجدوں سے راہ تو نکالی ہے
اُن کے آستانے تک اپنے آستانے سے

غنچے کا تبسم بھی، ہے شکست غنچے کی
حُسنِ ظن نہ کر پیدا میرے مسکرانے سے

سجدۂ نیاز اب میں کیوں کروں کسی در پر
ناز مانگ لایا ہوں اُن کے آستانے سے

عذر تو بجائے خود اک گناہِ ثانی ہے
ذوقِ جُرم بہتر ہے جُرم بخشوانے سے

نظمِ بزمِ عالم کا عزم ہے مگر سیماب
بیٹھنے بھی دیں مجھ کو گردشیں ٹھکانے سے

سنہ ۱۹۳۹ء

سوز سرمایہ ہے ہم سوختہ سامانوں کا
شمع کا اس میں اجارہ ہے نہ پروانوں کا
جس نے منہ پھیر دیا سارے صنم خانوں کا
تھا وہ اک قافلہ کعبے کے نگہبانوں کا
غارتِ مال کا ہے خوف کبھی جانوں کا
جھونپڑوں سے بھی بُرا حال ہے ایوانوں کا
ختم ہو دورِ غزل سنج خوش الحانوں کا
کاش اس بزم میں مجمع ہو حدی خوانوں کا
ہوش والے بھی تھے محتاط گزرنے میں جہاں
آج میلہ ہے وہاں قوم کے دیوانوں کا
وہی پستی ہے وہی بہکی ہوئی مستی ہے
کوئی مصرف بھی ہو اس دَور کے میخانوں کا
ہم سے شیرازۂ عالم کی نہ پوچھو روداد
ایک انبار ہے بکھرے ہوئے افسانوں کا
فکرِ منزل ہو تو بے راہ روی اولیٰ تر
کہ ہر اک راہ میں ڈیرا ہے تن آسانوں کا

جاں ابھی دی نہیں اور غرۂ جانبازی ہے
تو نے دیکھا ہی نہیں حوصلہ انسانوں کا
برہمن کیوں تجھے پتھر میں ہے جلووں کی تلاش
ارے ناداں یہ حصّہ ہے مسلمانوں کا
تیرا ہر لقمہ ہے اک لقمۂ مردار و حرام
گر ترے خوان پہ پس خوردہ ہے بیگانوں کا
تجھے تقسیم کی دھن ہے تو سُن لے جاہ پرست
ساری دنیا تری، اللہ مسلمانوں کا
بڑھتا آتا ہے حوادث کے سمندر کا چڑھاؤ
وہ شناور ہے جو رُخ پھیر دے طوفانوں کا
زندگی بھر رہی آوارہ سری اے سیماب
کوئی مرکز نہ بنا اُن کے پریشانوں کا

○
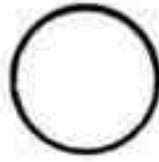
وطن کے بعد اربابِ وطن کی آزمایش ہے
چمن سے دور یارانِ چمن کی آزمایش ہے
پتنگوں کی نہ شمعِ انجمن کی آزمایش ہے
یہ سب تیرے ہی سوزِ جان و تن کی آزمایش ہے
مراتب کا کوئی درجہ نہیں ہستی کے محشر میں
یہاں اک رنگ سے سرو و سمن کی آزمایش ہے
گریبانِ سحر ہے چاک گیسوِ شام کا برہم
یہ دیوانے ترے دیوانے پن کی آزمایش ہے
تغافل ہے اُدھر محلوں کی بوجھل زندگانی میں
اِدھر صحرا میں نعشِ بے کفن کی آزمایش ہے
جنوں کو مرحمت کی جا رہی ہے شانِ پامردی
انھیں مدِ نظر دشت و دمن کی آزمایش ہے
دماغِ لالہ و گُل دے چکا ہے امتحاں اپنا
مزاجِ نسترین و نسترن کی آزمایش ہے
رواں ہیں خون کے دریا مساجد سے شوالوں تک
فضول اب ظرفِ شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

گئے وہ دن کہ تھا صرف امتحانِ شمع و پروانہ
وفا میں آج ساری انجمن کی آزمایش ہے
پہاڑ آئے ہیں سدِّ راہ ہونے راہِ منزل میں
یہ تیری ہمّتِ خارا شکن کی آزمایش ہے
رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے سمّیت غم کی
بس اب سوز و گدازِ روح و تن کی آزمایش ہے
دیا جاتا ہے دولت سے پیامِ امن و آزادی
نئے ڈھب سے غلامانِ کہن کی آزمایش ہے
نظر آتے ہیں وہ صورت میں اور اکثر نہیں آتے
سمجھتا ہوں یہ میرے حُسنِ ظن کی آزمایش ہے
سزا حق گوئی کی ہے موت، یا جُرمِ خموشی کی ؟
ہمارے بعد اب دار و رسن کی آزمایش ہے
فریبِ ارتقا ہے شعبدہ بازی سیاست کی
نئے سانچوں میں دستورِ کہن کی آزمایش ہے
نہ ہو جو گمرہی آگاہ، رہبر ہو نہیں سکتا
پرکھنا راہبر کا راہزن کی آزمایش ہے
بڑا فکر آزما یہ دَور ہے سیماب کیا کہیے
ہر اک میدان میں اہلِ سخن کی آزمایش ہے
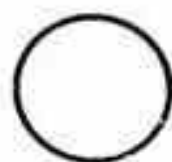
زہرابِ غم کو جذبِ رگِ جاں کیے ہوئے
خود زندگی ہے موت کا ساماں کیے ہوئے
آجا نئی حیات کے ساماں کیے ہوئے
ہر عشوے کو بہشت و بہاراں کیے ہوئے
جو آج کل ہے رحم کو ارزاں کیے ہوئے
انساں کا خون ہے یہی انساں کیے ہوئے
یہ پیشگی اثر ہے ورودِ بہار کا
وحشی کھڑے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
خوابِ شباب، آہِ سحر، رنگِ شامِ غم
یہ سب ہیں ایک اُن کے پریشاں کیے ہوئے
صحرا میں جگنوؤں سے ستاروں سے چرخ پر
فطرت ہے دور دور چراغاں کیے ہوئے
محشر تک آ گیا ہے مرا عالمِ جنوں
شیرازۂ دو کون پریشاں کیے ہوئے
اے سائل! اُن کے در پہ نہ مانگ اُن سے چل کے مانگ
بڑھ جا، درازِ گوشۂ داماں کیے ہوئے

پھر ہو کہیں طلوع کہ صدیاں گزر گئیں
ہستی کی وادیوں کو درخشاں کیے ہوئے

آمادۂ خرابیٔ عالم ہے ارتقا
قطرے کو بحر، بحر کو طوفاں کیے ہوئے

رکھنا تبرکات میں زنجیر کو مری
یہ بھی ہے سجدۂ درِ زنداں کیے ہوئے

پھر التفات کر کہ زمانہ گزر گیا
تجدیدِ عہد و زحمتِ پیماں کیے ہوئے

ہاں کفر بار ہو نگہِ مست سے مگر
اندازۂ نزاکتِ ایماں کیے ہوئے

فطرت کے تیوروں میں ہیں پھر کچھ نئے شکن
ایک اور انقلاب کا ساماں کیے ہوئے

سیماب ایک سادہ ورق ہے حیاتِ حال
مدت گزر گئی کوئی ارماں کیے ہوئے
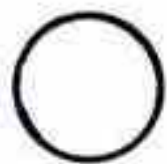
نفیر رہنما میں ہے، نوائے سارباں میں ہے
مری آواز بھی شامل درائے کارواں میں ہے
تو ناحق حسرتِ طولانیٔ عمرِ رواں میں ہے
حیاتِ جاوداں ترکِ حیاتِ جاوداں میں ہے
خدا جانے نہیں ہے یا نگاہِ رازداں میں ہے
کہ اک عنواں ہر تارا کتابِ آسماں میں ہے
ابھی سے فکرِ گنجایش زمین و آسماں میں ہے
اُٹھے گی پھر وہ دنیا جو حجابِ خاکداں میں ہے
لہو کتنی امیدیں جانے کس کس کی ہوئی ہوں گی
ابھی تک بوئے خوں گرد و غبارِ کارواں میں ہے
ملی تو مجھ کو آزادی، مگر اس عالمِ نو میں
قفس ہی کا سا اک عالم فضائے آشیاں میں ہے
بہت مشکل ہوا دیر و حرم کا متحد ہونا
کہ اب اک حدِ فاصل بانگِ ناقوس و اذاں میں ہے
مسافر اپنی سعیِ رائیگاں سے ہو نہ آزردہ
ترا ذوقِ طلب محفوظ سعیِ رائیگاں میں ہے

رہیں ہشیار جو آسودہ خاطر ہیں .بہاروں میں
کہ بوئے انقلابِ نو ہوائے گلستاں میں ہے
گلستاں لالہ گوں ہے خونِ ناحق سے مگر اب بھی
وہی پہلی سی رنگینی مزاجِ باغباں میں ہے
زمیں کے انقلاب اب تک ہزاروں آنکھ سے گزرے
نظر اب انتظارِ انقلابِ آسماں میں ہے
نظامت کیوں نہیں ملتی اسے دیر و کلیسا کی ؟
بصیرت کی کمی شاید حرم کے پاسباں میں ہے
دلِ انساں میں پیدا ہو تو انساں طور بن جائے
مرے سجدوں کی وہ گرمی جو سنگِ آستاں میں ہے
محبت مشترک اک قدر ہے ابنائے آدم کی
رواج اس کا ابھی باقی ہے اور سارے جہاں میں ہے
تقاضوں سے ہے محفل گرم، ہم خاموش بیٹھے ہیں
اثر کتنا ہماری نیم گفتہ داستاں میں ہے
بڑھائے جا یونہی گیرائیاں اپنی عقیدت کی
یقیں میں خود وہ آجائے گا کچھ کر جو گماں میں ہے
خدا وہ دن کرے برپا ہو محشر اور دیکھوں میں
کہ رودادِ جہاں کی پیش کش میری زباں میں ہے
بھلا دوں کس طرح سیماب صد سالہ تعلق کو
مرا سرمایۂ ماضی ابھی ہندستاں میں ہے
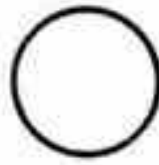
دیا پہلے تو میرے دل کو ذوقِ مدّعا تو نے
پھر اُس کو ناتمامی دے کے، سب کچھ دے دیا تو نے
جہانِ نَو کی دے کر اک نویدِ جاں فزا تو نے
مجھے خوابِ سرِ منزل سے بھی چونکا دیا تو نے
مزاجِ محفلِ عالم، بہت ناساز و برہم تھا
بدل دی اشک و آہِ عشق سے آب و ہوا تو نے
شبِ غم آنسوؤں کی اوٹ سے میں نے یہ دیکھا ہے
بڑھا کر ہاتھ اپنا چھو لیا دستِ دعا تو نے
تری عادت پہ قرباں اور اپنی وضعداری پر
کہ ساری عمر یارب کی خطائیں نے عطا تو نے
ابھی ہے سرفروشی، حدِ تکمیلِ وفاداری
ابھی سمجھا کہاں ہے میرا معیارِ وفا تو نے
مذاقِ عشق کو جب زود آمیزی عطا کی تھی
بنایا کیوں مزاجِ حُسن کو دیر آشنا تو نے
تجھے ڈھونڈے تو کس رستے سے ڈھونڈے ڈھونڈنے والا؟
کسی منزل پہ چھوڑا بھی ہے اپنا نقشِ پا تو نے؟

میں یہ سمجھا ہوں معنی انقلابِ ناگہانی کے
کہ جب چاہا، جہاں چاہا، بدل ڈالی فضا تو نے
مجھے کیوں سونپتا ہے انتظامِ محفلِ عالم
بنا رکھی تھی میں نے محفلِ عالم کہ یا تو نے؟
ترا ہونا تو برحق ہے مگر آئے یقیں کیوں کر
مری آواز پر اب تک کبھی دی ہے صدا تو نے؟
پرستش ماسوا کی اس لیے دستورِ دنیا ہے
کہ شاید رُخ پہ ڈالا ہو نقابِ ماسوا تو نے
وہ پیمانِ ازل، لاکھوں برس کی بات! رہنے دے
"الستُ" کہہ کے خود ہی کہہ دیا ہوگا "بلیٰ" تو نے
چمن میں رات بس لیتے، تو کیا دنیا بدل جاتی
وہ غنچے جن کو قبلِ شام ہی مرجھا دیا تو نے
ابھی تو اصل منزل دور ہے تیری رسائی کی
ابھی تو طور ہی تک طے کیا ہے فاصلا تو نے
ترے اشعار اے سیماب وہ سمجھے جو عارف ہو
کنائے ہی کنائے میں بہت کچھ کہہ دیا تو نے

○

مکینِ لامکاں تھے مسند آرائے جہاں ہم تھے
وہاں مطلق عروجِ آدمیّت تھا، جہاں ہم تھے

جہاں کوئی نہ تھا ہمسایۂ فطرت وہاں ہم تھے
ادا فہمِ مشیّت رازدارِ کُن فکاں ہم تھے

جہاں ہم تھے مسلسل تھی وہاں بارش تجلّی کی
وہاں انوار کے گھنگور بادل تھے جہاں ہم تھے

نشاطِ جاوداں سے کر دیا محروم کیوں ہم کو؟
خدا والے تھے، شایانِ نشاطِ جاوداں ہم تھے

پھر اُس پر یہ ستم، پستی میں پھینکا مادیّت کی
ندامت ہے کہ میرِ مجلسِ روحانیاں ہم تھے

مسلّم ہے ہماری اوّلیت بزمِ ہستی میں
ذرا اے بےخودی یہ تو بتا دیتی کہاں ہم تھے؟

اب اک جرعہ شرابِ کیف و مستی کا نہیں ملتا
کبھی مے خانۂ تسنیم کے پیرِ مغاں ہم تھے

بہت صبر آزما تھیں رہ گذاریں دارِ فانی کی
مگر ہر رہگذر میں کارواں در کارواں ہم تھے

ہمیں قسمت نے پھر اُس آستاں کے پاس پہنچایا
جہاں سجدے کیے اتنے ہی جتنے سرگراں ہم تھے
گدائے وارثی کہتی تھی ہم کو فخر سے دنیا
وقارِ ہند تھے ہم عظمتِ ہندوستاں ہم تھے
شکارِ گردشِ دوراں کیا پھر ہم کو فطرت نے
یکایک پھر اسیرِ انقلابِ ناگہاں ہم تھے
نہ ہے اب وہ جبیں سائی نہ سنگِ آستان اُن کا
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ وقفِ آستاں ہم تھے
حضوری سے کیا کیوں آج محروم آپ نے ہم کو
بتوں کے دور میں بھی آپ کے تسبیح خواں ہم تھے
ہمیں تو آپ سے جود و کرم ہی کی توقع تھی
کب اِس بیداد کے قابل نصیبِ دشمناں ہم تھے
اب افسانے ہی افسانے ہیں وہ بھی روح سے خالی
وہ کچھ اسرارِ لاہوتی تھی جن کے ترجماں ہم تھے
حریمِ دوست کی عصمت کو کیوں غیرت نہیں آتی
اب اُس کے پاسباں ہیں غیر جس کے پاسباں ہم تھے
مگر سیماب یہ ہے عارضی مجبوری و دوری
وہیں پھر لوٹنا ہے ایک دن ہم کو جہاں ہم تھے
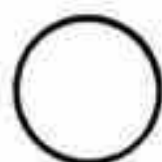
ہر ستم کی داد دے کر مسکرا دیتا ہوں میں
حُسن کو ذوقِ جفا کا حوصلا دیتا ہوں میں

اپنی خلوت اُن کے جلوؤں سے سجا دیتا ہوں میں
جب وہ آتے ہیں سبھی شمعیں بُجھا دیتا ہوں میں

ہیں زمانے میں مسلّم میری انساں سازیاں
خاک کے پُتلے کو بھی انساں بنا دیتا ہوں میں

میرے انفاسِ طلب میں منزلیں لیتی ہیں سانس
رہگذر کو ہر نفس اک رہنما دیتا ہوں میں

جب کوئی مہرِ وفا کا مجھ کو دیتا ہے فریب
دیکھ کر ماضی کی جانب مسکرا دیتا ہوں میں

کیا حواس و ہوش، دل کیا، جان کیا، ایمان کیا
لوٹنے والا تو ہو، سب کچھ لُٹا دیتا ہوں میں

یاد کرنے کا مزہ یہ ہے کہ گُم ہو ماسوا
جب وہ یاد آتے ہیں خود کو بھی بُھلا دیتا ہوں میں

سوزِ دل سے ہے محبّت میں بقائے جاوداں
زندگی کو آگ سے نشو و نما دیتا ہوں میں

میرا سجدہ ہے شکستِ سرکشی کا مُنات
سر جھکا کر ساری دنیا کو جھکا دیتا ہوں میں
تا وفا کو شانِ عالم پر مرا احساں رہے
کوئی لے تو قرض بھی جنسِ وفا دیتا ہوں میں
میرا درسِ زندگی ہے اک صدائے بازگشت
انتہا کو بھی نویدِ ابتدا دیتا ہوں میں
یہ نہیں منظور ہو ذوقِ نظر کا خاتمہ
خود اٹھا دیتا ہوں پردے خود گرا دیتا ہوں میں
خالقِ نورِ سویدا ہے مرا حُسنِ نظر
بھیک میں اندھوں کو پروینِ سہا دیتا ہوں میں
یہ مرا ایثار بھی شرحِ ہر افسانہ ہے
خون تو کرتا ہے کوئی، خوں بہا دیتا ہوں میں
اب کوئی مشکل سے کھا سکتا ہے منزل کا فریب
کارواں کو ذوقِ منزل آزما دیتا ہوں میں
طاق میں اکثر وہ رکھ دیتے ہیں جن کو چوم کر
دل انھیں افسردہ پھولوں میں ملا دیتا ہوں میں
ارتقائے آدمیّت ہے مری محفل کا دَور
بادہ کش کو ایک دن ساقی بنا دیتا ہوں میں
میرے استغنا کی اے سیماب فیاضی نہ پوچھ
ہر نظر سے اپنی درسِ کیمیا دیتا ہوں میں

○
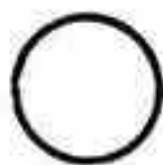
جسے تدبیر سے ابرام ہوا کرتا ہے
وہی ہر کام میں ناکام ہوا کرتا ہے

فکرِ انجام تجھے عشق میں کیوں ہے یعنی
اس کا آغاز ہی انجام ہوا کرتا ہے

وہم ہے تجھ کو تو علم اور نظر پیدا کر
علم ہی مانعِ اوہام ہوا کرتا ہے

وہ اعادہ ہے مرے وردِ سحر گاہی کا
جو بھرے باغ میں ہر شام ہوا کرتا ہے

جلوۂ مہر میں مہتاب کی تابانی میں
اُن سے ملنا سحر و شام ہوا کرتا ہے

جو حجابوں میں بھی مشکل سے نظر آتا تھا
اب وہ نظّارہ سرِ بام ہوا کرتا ہے

جب گزرتے ہیں رہِ صبر و رضا سے رہرو
سجدۂ شکریہ ہر گام ہوا کرتا ہے

اُسے بے نام ہی کر یاد جو کرنا ہے تجھے
نام لینے سے وہ بدنام ہوا کرتا ہے

پردۂ سرخوشی مے کدۂ رنداں میں
چارۂ گردشِ ایّام ہوا کرتا ہے
بادۂ عشق کی تخصیص ہے میرے ہی لیے
میرا مشرب بھی کہیں عام ہوا کرتا ہے
شعر یوں کہتا ہے بے فکر و تکلّف سیماب
جیسے اس شخص کو الہام ہوا کرتا ہے

خاک بوس آستانِ شاہِ جیلانی ہوں میں
کاش اسی مٹی میں مل جاؤں اگر فانی ہوں میں
آج کس دربار میں محوِ غزل خوانی ہوں میں
مطلعِ ثانی یہ کہتا ہے کہ لاثانی ہوں میں
واقفِ اسرارِ ایوانِ سلیمانی ہوں میں
ناز ہے عرفان کو مجھ پر وہ عرفانی ہوں میں
صدرِ محفل میں مرا منبر رہے سب سے بلند
مدح سنجِ حضرتِ محبوبِ سُبحانی ہوں میں
ہے تصور کو میسر حاضری بغداد کی
غوث اعظمؓ کا ارادت مندِ روحانی ہوں میں
سلسلہ میرا پہنچتا ہے شہِ لولاک تک
یادگارِ افتخارِ تاجِ انسانی ہوں میں
ہر بُنِ مو ہے مرا اک مشرقِ روحانیت
ظلمتِ عالم میں مجبورِ درخشانی ہوں میں
مجھ میں روحِ سرمدی ہے، میں سراپا روح ہوں
کون ہے پھر زندۂ جاوید اگر فانی ہوں میں

رفعتیں حائل ہیں میرے عجز کی تکمیل میں
ہیں چٹانیں جس کی سدِ راہ وہ پانی ہوں میں
سطوتِ نازونعم ہے میری نظروں میں حقیر
پُرغرور اک بندۂ درگاہِ سلطانی ہوں میں
ہو اگر ذوقِ یقیں، جمعیتِ خاطر بھی ہو
اصل میں اپنے لیے خود ہی پریشانی ہوں میں
تو مرے جوشِ خودی کی تہہ کو پہنچا ہی نہیں
مجھ میں جو قلزم بھرا ہے اس کی طغیانی ہوں میں
مجھ کو اے سیمابؔ غیروں کے چمن سے کیا غرض
اپنے ہی گلشن میں مصروفِ گُل افشانی ہوں میں

○
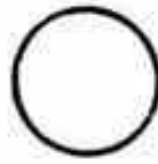
انیسِ خاطرِ آشفتہ کار کیا ہو گی
بہار کو نہ پکارو بہار کیا ہو گی
نگاہِ جلوہ طلب کا مگار کیا ہو گی
جب ایک بار نہیں بار بار کیا ہو گی
جنوں سے کوششِ ضبطِ بہار کیا ہو گی
چمن کی خاکِ چمن پردہ دار کیا ہو گی
انھیں کا قصۂ رنگیں ہے داستاں میری
یہ اُن کی خاطرِ نازک پہ بار کیا ہو گی
کنارِ ذوقِ ابد میں پلی ہے جو اُمید
حریفِ زندگیٔ مستعار کیا ہو گی
سکوتِ شامِ لحد ضامنِ سکوں ہے مگر
تلافیٔ دلِ شب زندہ دار کیا ہو گی
اب اُن کی عید بہ شکلِ وعید آتی ہے
ستم زدوں سے خوشی ہمکنار کیا ہو گی
ریاضِ قدس کے ہم لوگ رہنے والے ہیں
ہمیں ہوائے جہاں سازگار کیا ہو گی

خود اپنے کیف کا عرفان جس نظر کو نہیں
وہ دردِ عشق کی پروردگار کیا ہوگی
بڑھیں گے دامنِ منزل پہ قافلے والو!
نمازِ شکر سرِ رہگذار کیا ہوگی
جنوں ہے راز کشا، حُسن راز کا غمّاز
نگاہ پردہ درد پردہ دار کیا ہوگی
نگاہِ حُسن کو ہے زعم اپنی شوخی پر
خدا کے سامنے بھی شرمسار کیا ہوگی
ابھی مجاز بھی ہے راز آدمی کے لیے
حقیقت اس پر ابھی آشکار کیا ہوگی
بندھا ہوا ہے رگِ جاں سے رشتۂ غمِ دوست
اب اور رسمِ وفا استوار کیا ہوگی
رُخِ حیات کا غازہ ہے گردِ راہِ وفا
یہ جس کی خاک ہے وہ رہگذار کیا ہوگی
کلیم وطور پہ تنقید اہلِ ہوش غلط!
نہ جانے مصلحتِ حُسنِ یار کیا ہوگی
کفن کو خاک، لحد کو زمیں، نفس کو سکوں
اب اور قدرِ غریب الدّیار کیا ہوگی
ہوں انقلابِ طبیعت سے مطمئن سیماب
قرار ہے ہی نہیں بے قرار کیا ہوگی

سنہ ۱۹۵۰ء

○

فسردگی کی تہوں میں باقی حرارتِ زندگی ملے گی
نگاہ نے دور تک کُریدا، تو آگ دل میں دبی ملے گی

بہت منظّم ہے بزمِ عالم، یہاں مساوات ہی ملے گی
جو شام تک روشنی ملی ہے تو صبح تک تیرگی ملے گی

یہ ہے اصولاً یقیں کہ مر کر کوئی نئی زندگی ملے گی
حیات جب عارضی ملی ہے تو موت کیوں دائمی ملے گی!

سمجھ کے بے چارہ اُس نے مجھ کو گرا دیا اور بھی نظر سے
سمجھ رہا تھا کہ اُس کے در سے جزائے بے چارگی ملے گی

جو تجھ کو منزل پہ ہے پہنچنا تو چل مرے نقشِ رہبری پر
میں جس فضا سے گزر چکا ہوں فضا تجھے بھی وہی ملے گی

کشاکشوں سے بچا کے دامن خمیدہ سر چپ گزر جا
کہ شورشیں جس قدر ہیں سب کے مآل میں خامشی ملے گی

جگر تاروں کی تیرگی میں فشارِ ذرّوں کا روشنی میں
الٰہی اس حشرِ زندگی میں کسی کو تسکین بھی ملے گی؟

خوشی و غم سے یہاں دمادم ہے امتزاجِ مزاجِ عالم
نفس نفس پر ملے گا ماتم قدم قدم پر خوشی ملے گی
خودی جو معناً ہو خود پرستی تو ہے بلندی بھی عین پستی
ملے گا انساں کو رازِ ہستی خودی سے جب بیخودی ملے گی
جواب دیتی ہے جب بصارت تو عود کرتی ہے خود بصیرت
جہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے وہیں تجھے روشنی ملے گی
حیاتِ تازہ پہ مرنے والے حیاتِ تازہ ہے موت ہی سے
یہ زندگی پہلے ختم کر لے تو پھر نئی زندگی ملے گی
جہاں میں ہے دورِ کس مپرسی یہاں کسے کون پوچھتا ہے!
نہ قدرِ فرزانگی کی ہوگی نہ دادِ دیوانگی ملے گی
سکون کہتی ہے جس کو دنیا سکوت میں ہے نہ گفتگو میں
کلی! کہ ہے اک سکوتِ مطلق سکوں سے دامن تہی ملے گی
سجودِ آدم کی عظمتوں پر کرے گا جب غور نفسِ خودسر
تو آدمیت کی رفعتوں پر حقیقتِ آدمی ملے گی
دعائیں کریا نہ کر جو ملنا ہے اس میں کچھ بیش و کم نہ ہوگا
جو چیز تقدیر ہو چکی ہے بقدرِ تقدیر ہی ملے گی
عدم پہ ترجیح میں ازل میں وجود کو غالباً نہ دیتا
خبر نہ تھی، زندگی ہزاروں ستم ملائی ہوئی ملے گی
جو ہیبتِ فقر دیکھنی ہو گزر کسی بوریا نشیں پر
کہ سر بسجدہ تجھے یہیں پر جلالتِ خسروی ملے گی
نہ بھول اے تارکِ محبت! کہ ترکِ الفت بھی اک خلش ہے
جو پھانس تو نے نکال دی ہے وہ پھانس دل میں لگی ملے گی

ذرا سی خاطر شکستگی کی نہیں ہے برداشت آدمی کو
کلی کو وقتِ شکست دیکھو تو مسکراتی ہوئی ملے گی
سکوں سے مایوس ہو نہ راہی حیات ہے راہِ ابتدائی
ابھی تو منزل ہے دور تیری ملے گی تسکین بھی ملے گی
کہاں ہے سیماب کا وہ دل اب جو اُس کے پہلو میں جستجو کی
گھٹا ہوا سا دھواں ملے گا اُڑی ہوئی خاک سی ملے گی

گزر گیا گزراں دورِ غم، خوشی کی طرح
خزاں بھی ایک ہوا تھی بہار ہی کی طرح

تغیرات ہیں مجھ میں بھی زندگی کی طرح
کبھی کسی کی طرح ہوں کبھی کسی کی طرح

دو لفظ ایک ہی معنیٰ کے ہیں شکست و گفت
یہ وقت دل پہ بھی آتا رہا کلی کی طرح

تری گلی سے نکل کر بہت خراب ہوئے
کہیں نہ چین ملا پھر تری گلی کی طرح

نیاز ہی کی مرے ناز میں بھی شان رہی
خودی کی لہر بھی آئی تو بے خودی کی طرح

وہ بات مجھ سے کرے جس میں آدمیت ہو
فرشتے آئیں مرے پاس آدمی کی طرح

میں فطرتاً ہوں غم اندوز، قہقہہ کیسا!
ہنسی لبوں پہ نہ آئی کبھی ہنسی کی طرح

بے التفات میں اُن کے فریب پوشیدہ
کہ دشمنی بھی وہ کرتے ہیں دوستی کی طرح

رہِ حیات میں انساں کی آزمایش کو
ہے اک مقام غریبی بھی خواجگی کی طرح
رواج تیری پرستش کا آستاں سے نہیں
مرے نیاز نے ڈالی ہے بندگی کی طرح
اگرچہ دل میں کوئی مدّعا نہیں لیکن
کھڑا ہوا ہوں ترے در پہ ملتجی کی طرح
شریکِ حال توجہ ہوئی ہے جب اُن کی
چمک اٹھے ہیں اندھیرے بھی چاندنی کی طرح
جو یہ سمجھ لے تو مرنے سے پھر کوئی نہ ڈرے
کہ موت ایک حقیقت ہے زندگی کی طرح
نہ کر مری ابدی صحت و نشاط کی فکر
کہ چارہ گر مجھے جینا ہے آدمی کی طرح
شماتتِ اُمَرا، با وجودِ فقر نہ کی
غیور ہے کوئی سیمابِ وارثی کی طرح!!
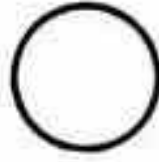
کوئے جاناں کے جب آثار نظر آتے ہیں
راستے مطلع الانوار نظر آتے ہیں
سرخوشِ نشۂ دیدار نظر آتے ہیں
آئینے پُشت بہ دیوار نظر آتے ہیں
زائچے عشق کے بے کار نظر آتے ہیں
یہ بھی اُن کے ہی طرفدار نظر آتے ہیں
سربسجدہ در و دیوار نظر آتے ہیں
میرے ویرانے کے آثار نظر آتے ہیں
متّحد کافر و دیں دار نظر آتے ہیں
فتنۂ نو کے پھر آثار نظر آتے ہیں
ہے یہ دُنیا برہِ راست نظریں اُن کی
آسرے سب مجھے بیکار نظر آتے ہیں
چشم بر راہ ہیں ہر راہگذر کے ذرّے
سب سفر کے لیے تیار نظر آتے ہیں
چُھپتے پھرتے ہیں وہ محشر میں کہ حسبِ وعدہ
سب اُنھیں طالبِ دیدار نظر آتے ہیں

رات کو اُٹھ کے بصیرت سے کبھی کام تو لے
تیرگی میں بھی کچھ انوار نظر آتے ہیں

بشریّت کے تقاضوں سے ہیں انساں بدنام
ناخطاوار، خطاوار نظر آتے ہیں

اِس خرابے میں مری عظمتِ رفتہ کے ہنوز
دھندلے دھندلے سے کچھ آثار نظر آتے ہیں

کل کسی قافلے میں جن کا نہ تھا کوئی مقام
آج وہ قافلہ سالار نظر آتے ہیں

مرضِ عشق کا ممکن ہے نظر ہی سے علاج
لوگ ہوتے نہیں بیمار، نظر آتے ہیں

لائی ہے صبحِ قیامت خبرِ آمدِ دوست
نظر آنے کے کچھ آثار نظر آتے ہیں

ہائے یہ دَور کہ اب میرے معاصر سیماب
سیکڑوں میں کہیں دو چار نظر آتے ہیں
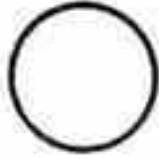
سحر ہوگی تو پھر ہوں گے افق سے ضو فگن ہم بھی
کہ سورج کی طرح ڈوبے ہیں اے شامِ وطن ہم بھی

ہیں اب آزاد مثلِ نکہت و رنگِ چمن ہم بھی
وطن کو چھوڑ کر سمجھے ہیں مفہومِ وطن ہم بھی

سمجھتے ہیں اسے راہِ یقیں کا راہزن ہم بھی
خرد کا دیکھتے آئے ہیں یہ دیوانہ پن ہم بھی

قدامت پروری کا طعن کیا دیں دَیرِ کہنہ کو
ابھی تک ہیں پرستارِ روایاتِ کہن ہم بھی

حقیقت ہے کہ اک پتھر نہ توڑا عمر بھر ہم نے
مگر رسماً کہے جاتے رہے ہیں بُت شکن ہم بھی

وہی بُت خانے میں آتا نظر جو کچھ حرم میں ہے
جو ہوتے حاملِ حُسنِ نگاہِ برہمن ہم بھی

الا اے اہلِ گلشن! خوش رہو لیکن یہ سُن رکھو
تمھاری ہی طرح تھے رنگ و آہنگِ چمن ہم بھی

قیامت کو ضرورت ہو تو وقتی طور پر لے لے
لگا لائے ہیں اپنے ساتھ اک صبحِ کفن ہم بھی

ہمیں بھی ساتھ لے لیں شمع بردارانِ آزادی
کہ ہیں مدت سے مشتاقِ فروغِ انجمن ہم بھی
ذرا سی بات پر سر پھوڑنا ہم کو نہیں آتا
سمجھنے کو سمجھتے ہیں مذاقِ کوہکن ہم بھی
سُنا یہ ہے کہ تم سب کے خدا ہو سب کی سنتے ہو
اجازت ہو تو ہوں آمادۂ عرضِ سخن ہم بھی
نہ کر اے آب جو گلشن بداماںی پہ ناز اتنا
تجھے تو یاد ہوگا تھے چمن اندر چمن ہم بھی
گراں عظمت فرشتے عالمِ بالا پہ ہیں لیکن
کچھ اپنا وزن رکھتے ہیں تہِ چرخِ کہن ہم بھی
کوئی ہم سے بھی پوچھے! انجمن کی جلوہ سامانی
رہے ہیں آئینہ بن کر میانِ انجمن ہم بھی
زمانے کا تقاضا ہے یہ گرد آلودگی اپنی
زمانہ پیرہن بدلے تو بدلیں پیرہن ہم بھی
نہیں سیماب ہم کو یادہوئے عام سے مطلب
کہ ہیں منجملۂ خلوت نشینانِ وطن ہم بھی
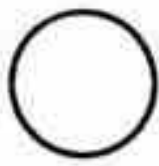
یہی مشکل شکن، عقدہ کُشا معلوم ہوتی ہے
محبّت میں مجھے شانِ خدا معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا جو سراپا شعبدا معلوم ہوتی ہے
بصیرت کی نظر سے دیکھ کیا معلوم ہوتی ہے
سکوں افزا، دل افزا، جانفزا معلوم ہوتی ہے
محبّت ہی محبّت کی دوا معلوم ہوتی ہے
حیات اب رو براہِ انتہا معلوم ہوتی ہے
کہ ہر آواز، آوازِ درا معلوم ہوتی ہے
کُھلا کرتی ہیں آنکھیں منزلِ دل تک پہنچنے پر
یہاں آکر حقیقت آئینا معلوم ہوتی ہے
یہ دوری کا کرشمہ ہے کہ میری آہ اُس در تک
رسا ہوتی ہے لیکن نارسا معلوم ہوتی ہے
صنم خانہ نہیں تو اور کیا ہے عالمِ صورت!
ہر اک تصویر کافر ماجرا معلوم ہوتی ہے

وہ غافل ہو کے اپنی یاد کی شدّت بڑھاتے ہیں
تغافل میں بھی اک شانِ وفا معلوم ہوتی ہے
کوئی آواز نے کہتا ہے کوئی ساز کا نغمہ
مجھے تو خود بدولت کی صدا معلوم ہوتی ہے
کسے چھوڑوں کسے اپنا بنالوں کیا کروں یارب!
یہ دنیا ماسوا ہی ماسوا معلوم ہوتی ہے
وجودِ حق ابھی ہے درسِ اوّل ذہنِ انساں کا
یہ علم و آگہی کی انتہا معلوم ہوتی ہے
سمندر کا یہ ظرف! اور اس میں پیہم اضطراب ایسا
مجھے ہر موج آتش زیر پا معلوم ہوتی ہے
وہ خود اپنی نظر کے راز سے نا آشنا ہوں گے
جنھیں اپنی نظر راز آشنا معلوم ہوتی ہے
حقیقت عالمِ معلوم کی پہچاننے والو!
حقیقت میں یہ ہے معلوم یا معلوم ہوتی ہے
کبھی شادابیاں اس سرزمیں کو مل نہیں سکتیں
یہ قرباں گاہِ اربابِ وفا معلوم ہوتی ہے
نہ گھبرا نالۂ مظلوم! سُن لے گا خدا اک دن
خدائی آج تیری ہم نوا معلوم ہوتی ہے
دبا رکھا تھا جس کو ضبط نے غربت کے سینے میں
وہ شورش اب جہاں میں جا بجا معلوم ہوتی ہے
یہ راز اب دورِ غربت میں کھُلا بے خانماں ہو کر
گھٹا کیوں غم نصیبوں کو بلا معلوم ہوتی ہے

کچھ ایسے وقت بھی آتے ہیں جب مایوس انساں کو
خوشی بھی اک طرح کا سانحا معلوم ہوتی ہے
ہوا باندھی ہے آزادی کی یارانِ گلستاں نے
مگر یہ صرف کچھ دن کی ہوا معلوم ہوتی ہے
شگفتِ خاطر اے سیماب تھی جو شاعری پہلے
طبیعت پر وہ اب اک بار سا معلوم ہوتی ہے

قاصد ہیں جبرئیل علیہ السّلام بھی
ہے کیا مقام شعر و ادب کا مقام بھی

ہیں اہلِ ظرف و ذوق بھی ہوں تشنہ کام بھی
میرے لیے حلال ہے شُربِ مدام بھی

وہ بھی ہیں اور گرم ہے دربارِ عام بھی
اے کاش ہو مجالِ سلام و کلام بھی

دنیا کا ہجرِ دوست نے بدلا نظام بھی
ایسا ہوا کہ صبح کے ساتھ آئی شام بھی

وہ لوگ کامگار ہیں جو پختہ کار ہیں
تیرا تو ذوق خام بھی ہے ناتمام بھی

فطرت پرست ہوں مری قسمت میں کیا نہیں
روشن عذارِ صبح بھی گیسوئے شام بھی

کیسا غرور اپنی برہمیٔ حال پر کروں
بگڑا ہوا ہے بزمِ جہاں کا نظام بھی

ہو دور میں نگاہ تو غم ہے ہر اک خوشی
آئینۂ سحر میں جھلکتی ہے شام بھی

کس چیز کی کمی ہے مجھے، گو اسیر ہوں
اللہ کے کرم سے ہے دانہ بھی دام بھی

موقوف ہے صلاحیتِ اکتساب پر
فیضان اُن کا خاص بھی ہے اور عام بھی

اس دور میں قناعتِ اہلِ نگاہ دیکھ
ہے برقِ طور جلوۂ بالائے بام بھی

تیرے حضور رقص بھی جائز ہے، وجد کیا!
ورنہ مرا سجود بھی ناقص، قیام بھی

ہے ہر جگہ مگر کہیں اُس کا پتہ نہیں
وہ صاحبِ مقام بھی ہے لا مقام بھی

اے وائے فرطِ شوق کی بے احتیاطیاں!
لیتے نہیں ہیں اب وہ محبّت کا نام بھی

دانستہ لے فراق کی لذّت کبھی کبھی
یعنی ہے اک عذاب وصالِ دوام بھی

میری شبِ مزار کی ویرانیاں نہ پوچھ!
ٹوٹا پڑا ہے سلسلۂ صبح و شام بھی

اے یار تیرا ذکر ہے ذکرِ خدا کے ساتھ
"یارب" کہا تو جیسے لیا تیرا نام بھی

پیمانِ شام مجھ کو یقیں دل کو اضطراب!
جی چاہتا ہے صبح سے ہو جائے شام بھی

جی میں ہے صید خانے سے پرواز کیجیے
اور اس طرح کہ ساتھ قفس بھی ہو دام بھی
سیماب جو پیمبرِ امن و سلام ہیں
اُن کو مرا درود بھی پہنچے سلام بھی

بہ زمانۂ علالت

○ دل کی تھی دل میں اور ذہن کی ذہن میں تھی ۲۳۱

○ رنگیں ترا غدار ہے میری نظر سے دور ۲۳۲

۱۴ نومبر ۱۹۵۰ء کی شب بہ زمانۂ علالت اور بہ حالتِ فالج میں کہی گئی
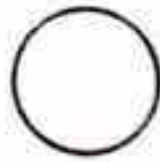
دل کی تھی دل میں اور دہن کی دہن میں تھی
یہ اک عجیب بات تری انجمن میں تھی

ہم تھے تو ایک دھوم سی باغ اور بن میں تھی
ہر رنگ کی بہار ہمارے چمن میں تھی

شامِ ابد کی مجھ پہ نمایاں تھی واردات
اس درجہ روشنی مری صبحِ کفن میں تھی

قائم مقام کوئی نہ تھا میرا بعدِ مرگ
خالی جگہ بھی اُن کی بھری انجمن میں تھی

آخر اجل نے آ کے کیا اس کا فیصلہ
دنیا سے اک نزاعِ غلط ما و من میں تھی

دل تھا مرا حوادثِ دنیا سے سوزناک
گویا کہ ایک شمع کسی انجمن میں تھی

گر تھا نہ کوئی راز تو بُت کیوں خموش تھے
کوئی تو بات بُت کدۂ برہمن میں تھی

وہ دیس میں شہید ہوئے یہ بدیس میں
یہ وجہ امتیاز حسین و حسن میں تھی

آتا تھا ذکر "تاج" برابر زبان پر
سیماب روح حشر میں یادِ وطن میں تھی

۳۰ نومبر [illegible] بزمانۂ علالت کہی گئی

رنگیں ترا عذار ہے میری نظر سے دور
گلشن مع بہار ہے میری نظر سے دور

محو نظارہ یار ہے میری نظر سے دور
میرا ہی انتظار ہے میری نظر سے دور

ہوں رہگذارِ شوق میں پاکوب رات دن
حالانکہ رہگذار ہے میری نظر سے دور

میں کر رہا ہوں قطعِ تعلق جہان سے
تصویرِ روزگار ہے میری نظر سے دور

محسوس مجھ کو ہر بُنِ مو میں ہے نوکِ خار
گو نیشِ نوکِ خار ہے میری نظر سے دور

ہے آستانِ یار پہ ہردم مری جبیں
گو آستانِ یار ہے میری نظر سے دور

سیماب جیسے باغ سے ہو دور فصلِ گُل
یوں چہرۂ نگار ہے میری نظر سے دور

خوشنویس: ایس۔ ایم۔ منظر

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے (مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بننے کیلئے وٹس ایپ پر رابطہ کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067